قیمت : -/10 روپے

نومبر 2009

اردو دنیا

جدید ہندوستان کے معمار

مولانا ابوالکلام آزاد

پنڈت جواہر لال نہرو

مسز اندرا گاندھی

قومی اردو کونسل کی گرانٹ ان ایڈ کمیٹی کی میٹنگ منعقدہ 29 ستمبر 2009 میں دائیں سے: پروفیسر صادق، جناب موسیٰ رضا، کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ،
کونسل کے وائس چیئرمین جناب چندر بھان خیال، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی اور جناب منصور عثمانی۔

دائیں سے: جناب چندر بھان خیال، جناب صدیق الرحمٰن قدوائی، جناب منصور عثمانی، جناب مولا بخش، جناب نور الحق قادری، کونسل کے عملے کے ارکان محترمہ مسرت جہاں، مجیب احمد اور
کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ — میٹنگ میں کونسل کی مختلف اسکیموں کے تحت رضا کار تنظیموں اور اسکالروں کو 60,97,003 روپے کی مالی معاونت فراہم کرنے کی منظوری دی گئی۔

اردو دنیا

قومی اردو کونسل کا ماہانہ رسالہ
جلد۔11، شمارہ۔11، نومبر 2009

مدیر: ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

اعزازی مدیر: مخمور سعیدی

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

کمپوزنگ: شہناز اختر

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا،
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک۔1، ونگ-6
آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی- 066 110
فون: 26103381، 26103938
26108159 فیکس: 26179657
ویب سائٹ:
http://www.urducouncil.nic.in
email: urduduniyancpul@yahoo.co.in
urducouncil@gmail.com

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109748، 26169416

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس،
بلاک نمبر 5-1، چھتہ بازار، حیدرآباد-500002
فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

آپ کی بات .... قارئین کے خطوط 2
ہماری بات .... ادارہ 8

تاریخ، ادب اور سیاست

● نہرو اور آزاد کے تعلقات .... شعیب اعظمی 9
● مولانا آزاد کی نگاہ میں عورتوں کا مقام .... منی بھوشن کمار 14
● محبت کا مغنی احمد فراز .... سیدہ جعفر 20
● چلبست کا قائم کردہ کشمیری کلب .... نجیب کمار 23
● اردو شاعری اور علم طب .... عزیز اندوری 26

کلاسیکی ادب

● غزلیں .... اشرف علی خاں فغاں 29
● نصوح کا خواب .... ڈپٹی نذیر احمد 30

سفرنامہ

● انگلینڈ کا سفر بھی رہا باعث ظفر .... اسد رضا 37

رفتگاں

● جمنا داس اختر .... فاروق ارگلی 40

کیریئر

● امریکہ میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے .... (بہ شکریہ ''اسپین'') 42

ہماری مطبوعات سے

● مرزا دبیر کا ادبی مرتبہ .... مرزا محمد زماں آزردہ 47
● زعفران کے پھول (تزک جہانگیری سے) .... مترجم: اقبال حسین 50

اردو خبرنامہ .... ادارہ 55

تبصرہ و تعارف 67

● سخنوران گجرات .... معید رشیدی ....
● کتاب کی تاریخ .... عبدالسمیع ....
● کلیات اسعد بدایونی .... محمد امتیاز عالم ....
● آزادی کے بعد ہندوستان کا اردو ادب .... ابوبکر عباد ....
● شاعر، دانشور فراق گورکھپوری .... ابوظہیر ربانی ....
● لاوا .... عاقل زیاد ....

بچوں کا گوشہ

● اخروٹ والی میٹھی روٹی .... زہرہ پری رخ 73
● ملا نصرالدین آفندی کے لطیفے .... ایم یوسف انصاری 76
● سردی کا موسم .... فراغ روہوی 77

آپ کی بات

■ **پروفیسر شفیق احمد خان ندوی، فیکلٹی آف ہیومنیٹیز اینڈ لینگویجز**
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی-110025

قومی کونسل سے آپ کی غیر حاضری ہمارے لیے نہایت قلق اور دکھ کا باعث رہی تھی۔ غائبانہ طور پر آپ کی آمد کے لیے کتنے ہی لوگوں نے دعائیں کی تھیں؛ کیونکہ آپ کے ذریعہ اردو زبان اور ملی مفادات کے دروازے بہت دن تک کھلے رہے تھے۔ امید ہے کہ انشاء اللہ وہ سلسلہ دوبارہ اور بھی زیادہ قوت سے جاری ہوگا۔ اردو زبان و ادب کی تحسین و پختگی کے عمل میں عربی زبان و ادب کا کردار مسلّم ہے۔ اس حقیقت کی شناخت کرتے ہوئے فنکشنل عربی کی ترویج کا جو کام آپ نے سرانجام دلایا ہے، وہ انشاء اللہ یاد رکھا جائے گا اور آپ کے نامۂ اعمال میں بطور حسنات شامل ہو کر باعث اجر ہوگا۔

■ **پروفیسر عبدالغفار شکیل، 51، سیکنڈ مین، نزد پوسٹ آفس،**
نئی میگاپ۔اے، لے آؤٹ، میسور-570015

آپ دوبارہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر کے عہدے پر فائز ہوئے اس سے مجھے ذاتی طور پر بڑی خوشی ہوئی دل ہی دل میں میں آپ کے لیے دعائیں کرتا رہا اور مجھے یقین تھا کہ آپ دوبارہ اپنی بہترین انتظامی صلاحیتوں کے ساتھ خدمات انجام دیں گے۔

■ **ڈاکٹر شمیم احمد صدیقی، بی-2، نسیم منزل، مدح گنج پولیس چوکی،**
سیتاپور روڈ، لکھنؤ-226020

ستمبر 2009 کے شمارے میں راجپورہ (پنجاب) کے کرتار سنگھ صاحب کا خط پڑھا۔ خاکسار ان کو مبارکباد پیش کرتا ہے کہ انھوں نے باوجود پیرانہ سالی کے خود اپنے شوق سے قومی اردو کونسل کے مالیرکوٹلہ اسٹڈی سینٹر سے ایک سال کی مختصر مدت میں اتنی اردو سیکھ لی کہ مذکورہ خط تحریر کیا۔ مزید یہ کہ انھوں نے دیگر نو افراد کو بھی اردو سکھا دی۔ یہ ان کی لگن اور اردو دوستی کا ثبوت ہے۔ کرتار سنگھ صاحب نے فرمایا ہے کہ وہ اپریل 2009 سے ''اردو دنیا'' کا مطالعہ کر رہے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ یہ ایک رسالہ نہ ہو کر دفتر کی رپورٹ محسوس ہوتا ہے۔ انھوں نے ''اردو دنیا'' کو ایسا پرکشش رسالہ بنانے کا مطالبہ کیا ہے کہ اس میں ہر پڑھنے والے کو اپنی پسند کا کچھ نہ کچھ مواد ضرور ملے اور وہ ہر ماہ رسالے کا بے صبری سے انتظار کرے۔ ان کو اس بات کا قلق ہے کہ صوبۂ پنجاب میں پٹیالہ سے چنڈی گڑھ تک کسی جگہ اردو کا ایک لفظ لکھا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔ اردو کی موجودہ زبوں حالی کے سلسلے میں انھوں نے اپنے ساتھ بیتا ہوا واقعہ بھی بیان کیا ہے کہ ایک موقع پر راجپورہ میونسپل بورڈ کے دفتر میں انھوں نے ایک اردو ڈاکومنٹ کو پڑھ کر وہاں کے عملے کی پریشانی دور کی جس کو پڑھنے کے لیے دفتر میں کوئی اردو داں موجود نہ تھا۔

کرتار سنگھ صاحب اردو کی موجودہ بدحالی سے بے حد دل برداشتہ ہیں اور چونکہ قومی اردو کونسل کا پورا نام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ہے لہٰذا ان کے دلی جذبات ہیں کہ قومی اردو کونسل کو کچھ اس انداز سے فروغ اردو کے لیے جدوجہد کرنا چاہیے کہ ہندوستان کا بچہ بچہ اردو لکھنے پڑھنے والا بن جائے۔ بلاشبہ اردو کے ہر مخلص دوست کا یہی جذبہ ہونا چاہیے۔ ان کے خط میں جو دو تین جملے قدرے تلخ ہوگئے ہیں وہ ان کی اسی اردو دوستی کے غماز ہیں۔ غالباً اسی کا احساس کرتے ہوئے ادارے نے بھی کرتار سنگھ صاحب کے خط کا قطعی برا نہیں مانا بلکہ اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کے خط کو بلا کم و کاست شائع بھی کردیا۔ چونکہ راقم السطور ''اردو دنیا'' کو اس کی اشاعت کے سال اوّل سے دیکھتا آرہا ہے اور اردو کونسل کی کارکردگی سے کسی حد تک واقفیت رکھتا ہے لہٰذا کرتار سنگھ صاحب کے فرمودات پر کچھ کہنے کی جسارت کی جارہی ہے۔

عرض ہے کہ ہر اخبار یا رسالے کی پالیسی میں فرق ہوتا ہے۔ ایک ادبی رسالے میں افسانے، کہانیاں، مزاحیہ فیچر، ادبی مضامین، غزلیں، نظمیں نیز کتابوں پر تبصرے وغیرہ شائع ہوتے ہیں۔ اسپورٹس میگزین میں تمام مشمولات کھیل کود سے متعلق ہوتے ہیں، فلمی رسالے میں تمام مضامین، خبروں اور تبصروں کا محور فلمیں یا فلم اسٹار ہوتے ہیں۔ البتہ وہ رسالے جو سفر و حضر میں محض وقت گزاری کے لیے پڑھے جاتے ہیں ان میں افسانے، سیاسی اتھل پتھل، حفظان صحت، کھیل کود، فلمی معلومات وغیرہ تمام چیزوں کو شامل کیا جاتا ہے۔ جہاں تک ''اردو دنیا'' کا سوال ہے تو یہ ایک سنجیدہ ادبی و معلوماتی جریدہ ہے جس میں نہ صرف زبان و ادب بلکہ سائنس اور ٹیکنالوجی، طب و صحت، سماجی مسائل، سیاسی عوامل، کھیل کود، کیریئر گائیڈنس اور دیگر موضوعات سے متعلق معیاری مضامین دیکھنے کو ملتے ہیں لیکن ہر شمارے میں ان میں سے ہر چیز پر مواد موجود ہو یہ ضروری نہیں۔ اس کے تقریباً ایک چوتھائی صفحات کے ذریعے قارئین کو روشناس کرایا جاتا ہے کہ کس مقام کے لوگوں نے فروغ اردو کے لیے کیا اقدامات کیے۔ کہاں مشاعرے یا دیگر ادبی محفلیں منعقد ہوئیں۔ کس کالج یا یونیورسٹی نے اپنے یہاں اردو کی تعلیم کا انتظام کیا۔ اردو کے کن ادبا و شعرا کو انعامات سے نوازا گیا۔ کب اور کہاں اردو کتابوں کا میلہ یا نمائش منعقد ہوئی یا

ہونے والی ہے۔ اردو کے کون کون جانباز سپاہی اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے اور انھوں نے اردو کی کیا کیا خدمات انجام دی تھیں۔ کس صوبے کی حکومت نے اردو عوام کے مطالبے کو منظور کرتے ہوئے اپنے صوبے میں قائم اردو اکادمی کی گرانٹ میں اضافہ کر دیا وغیرہ وغیرہ۔ اردو کے پرستاروں کو اردو کی بہتری کی خبریں پڑھ کر سکون ملتا ہے اور ان کو اس طرح کی خبریں جاننے کا اشتیاق رہتا ہے۔ اسی لیے ''اردو دنیا'' کے قارئین کو اس کے ہر نئے شمارے کی آمد کا انتظار رہتا ہے۔

''اردو دنیا'' کے ہر شمارے میں چھ تا آٹھ اردو کتابوں پر تبصرے بھی شائع ہوتے ہیں۔ ان تبصروں کے ذریعے نئے قلم کاروں کو روشنی ملتی ہے۔ رسالے کے آخری دو تین صفحات بچوں کے ادب کے لیے مختص ہوتے ہیں۔

جہاں تک فروغ اردو کے سلسلے کے دوسرے کاموں کا تعلق ہے تو راقم السطور عرض کرتا ہے کہ کونسل ان کاموں کے لیے صوبائی اردو اکادمیوں، تعلیمی اداروں یا غیر سرکاری و فلاحی انجمنوں کو مناسب گرانٹ دیتی ہے۔ کونسل کے مختلف سرٹیفکیٹ اور ڈپلوما کورسز مکمل کرنے کے بعد ہونہار طلبہ میں اچھی خاصی استعداد پیدا ہوجاتی ہے۔ خاکسار لکھنؤ اور دیگر مقامات کے کئی ایسے نوجوان لڑکے لڑکیوں سے واقف ہے جنھوں نے کونسل کا ملٹی لنگول کمپیوٹر ڈپلوما کورس مکمل کرنے کے بعد اپنی روزی روٹی کا انتظام کرلیا۔ کونسل قلم کاروں کو اپنی تخلیقات شائع کرانے کے لیے گرانٹ دیتی ہے اور شائع شدہ کتابوں اور رسالوں کو یک مشت خرید کر مختلف لائبریریوں کو بھجواتی ہے۔ ہندوستان کے بڑے شہروں میں ہر سال کتاب میلوں کے انعقاد کے علاوہ چھوٹے شہروں اور قصبات کے اردو داں عوام کی سہولت کے لیے موبائل کتاب وین بھی چلائی گئی ہے۔ ہاں ان تمام کاموں کا اس طرح کا فوری اثر دکھائی نہیں دیتا کہ پٹیالہ سے چنڈی گڑھ تک دکانوں کے سائن بورڈ یا مکانوں کی نیم پلیٹ اردو میں لکھی ہوئی دکھائی دیں کیونکہ کسی بھی درخت پر پھل آنے میں کچھ نہ کچھ وقت ضرور لگتا ہے۔ شاید کرتار سنگھ صاحب کے علم میں یہ بات ہو کہ ملک کی آزادی اور تقسیم کے وقت پنجاب کا ہر بالغ شخص اردو سے بخوبی واقف تھا اور وہاں بڑی تعداد میں اردو ادبا و شعرا موجود تھے جن کے کچھ آثار آج بھی دکھائی دے رہے ہیں۔ اگر ملک کی آزادی کے بعد مختلف مرکزی اور صوبائی حکومتوں نے اردو کے ساتھ سوتیلے پن کا سلوک نہ کیا ہوتا اور ہمارے بڑوں نے گھروں میں بچوں کی اردو تعلیم کا اہتمام کیا ہوتا تو صورتِ حال مختلف ہوتی آخر میں راقم السطور کی کرتار سنگھ صاحب سے گزارش ہے کہ صرف چند افراد کو اردو سکھانے پر اکتفا نہ کریں۔ مزید لوگوں کو ترغیب دے کر ان کو اردو سکھائیں اور ان میں اپنا سا جذبہ بھی پیدا کرنے کی کوشش کریں تاکہ وہ بھی چراغ سے چراغ جلائیں۔

■ ایم۔ راگھوراؤ نائڈو، ساؤتھ سول لائنس، چھندواڑا، مدھیہ پردیش

''اردو دنیا'' کے زیرِ نظر شمارے میں یوں تو کئی مضامین اہمیت کے حامل ہیں لیکن خصوصی طور پر ''اردو اور اردو والوں کی ذمے داریاں''، ''1857 کے مجاہدین آزادی'' اور ''قومی یکجہتی اور ہندوستانی زبانیں'' زیادہ پسند آئے۔

''ہماری بات'' کے تحت آپ نے صحیح لکھا ہے کہ انصاف میں تاخیر نہیں ہونی چاہیے، غریب طبقے کی انصاف تک پہنچ مشکل ہوگئی ہے۔ اصلی مجرم بچ نکلتا ہے جبکہ بدنیتی سے ملزم بنائے جانے والے لوگوں کو پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ فاصلاتی تعلیم پر محمد احسن صاحب نے بہت ہی مفید جانکاری دی ہے۔ خالد محمود نے اردو والوں کو ان کی ذمے داریوں کا احساس کرایا۔ اردو زبان کی بدحالی میں غفلت شعاری کا ہاتھ ہے، زبانیں حکومت کے بل پر زندہ نہیں رہتیں۔ اسکولوں میں انتظام نہ ہونے کی صورت میں بچوں کو گھر پر اردو کی تعلیم دینا چاہیے۔ احسان حسن صاحب کے مضمون کا عنوان ''جب لوگ پی۔ ایچ۔ ڈی میں فیل ہوں گے۔ ہونا تھا، آج پی۔ ایچ۔ ڈی میں ناکامیاب ہونے کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ ریسرچ کے نام پر ادھر کا مال ادھر کیا جاتا ہے۔ اس پر اگر لگام لگا دی جائے تو ادب کے پوشیدہ گوشوں کی تلاش ہوگی اور غیر سنجیدہ لوگوں کی آمد پر روک لگے گی۔ اگر ہم 1857 کے مجاہدین آزادی کے مقاصد ہندوستان کے دونوں بڑے مذاہب کے متعلق ان کے نظریات کو سمجھ کر ملک میں عام کریں تو ملک سے فرقہ وارانہ ناسور کو ختم کیا جاسکتا ہے۔

زبانیں ہدایت ناموں سے نہیں بنا کرتیں۔ ان کے ارتقا کی اپنی ڈگر ہوتی ہے، زبان کے معاملے میں جماعتیں مذہب سے بھی زیادہ جذباتی ہوجاتی ہیں۔ زبانوں کو شخصیت متحرک کہا گیا ہے۔ پوری تہذیب کا مظہر زبان ہوتی ہے۔

''اردو دنیا'' کے ستمبر 2009 کے شمارے میں کرتار سنگھ صاحب کا خط پڑھ کر لگا کہ مجھے بھی ایسا ہی ایک خط لکھنا چاہیے۔ بہت پہلے میں نے جامعہ ملیہ دہلی سے خط کتابت کے ذریعے اردو سیکھنا شروع کیا تھا پر اس دوران بیمار پڑ جانے کی وجہ سے یہ سلسلہ قائم نہیں رکھ پایا اور جو کچھ سیکھا تھا وہ بھی بھول گیا، 2003 میں رٹائر ہونے کے بعد مولانا آزاد اردو یونیورسٹی حیدرآباد سے خط کتابت کورس کیا۔ امتحان تو نہ دے سکا پر تھوڑا بہت سیکھ گیا۔ ہمارے شہر میں اردو کی کتابیں نہیں ملتیں۔ میں نے دہلی سے اردو کی کتابیں منگوائیں اور اپنی مشق جاری رکھی۔ دو سال پہلے اردو کی کتابیں خریدنے کے مقصد سے ناگپور گیا۔ وہاں مجھے ''اردو دنیا'' اور ''سائنس کی دنیا'' یہ دو رسالے ملنے میں ان رسالوں کا سالانہ گاہک بن گیا کچھ دنوں بعد ''فکر و تحقیق'' کا بھی گاہک بن گیا۔ مسلسل ریاض سے میرے حوصلے میں اضافہ ہوا اور میں نے ''اردو دنیا'' کو اپنی رائے لکھ بھیجی ''اردو دنیا'' اکتوبر 2008 کے شمارے میں میرا خط چھپا۔ اس دن میری خوشی کا ٹھکانا نہ تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں نے کوئی بہت بڑا امتحان پاس

کرلیا ہے۔ خط لکھنے کا یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

قرآن خوانی کے مقصد سے مسلمان بھائی بچوں کو عربی سکھاتے ہیں۔ ان سے میرا کہنا ہے کہ وہ عربی کے ساتھ ساتھ اردو بھی سکھائیں۔ ''اردو دنیا'' میں اردو زبان کے فروغ سے تعلق رکھنے والے جو مضمون چھپتے ہیں ان سبھی کا حوالہ دیتے ہوئے بار بار درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم دیں۔ پر میں نے محسوس کیا کہ اردو والے میری بات کو سنجیدگی سے نہیں لیتے۔ اردو کے فروغ کے لیے اگر کوئی ٹھوس قدم نہ اٹھایا گیا تو وہ دن دور نہیں جب لیٹن اور سنسکرت کی طرح یہ بھی ایک مردہ زبان ہو کر رہ جائے گی۔

■ ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی، سابق ممبر راجیہ سبھا، نئی دہلی

''اردو دنیا'' کے اگست 2009 کے شمارے میں زبان اور تعلیم پر تینوں مضامین بڑے ہی معلوماتی اور کارآمد ہیں اسی طرح پیغمبر اسلام کو منظوم خراج عقیدت، نثار احمد فاروقی اور اردو اخبارات کے لسانی و تہذیبی سروکار بھی بہت پسند آئے۔

روبرو کے تحت جناب زبیر رضوی سے گفتگو، انٹرویو بہت ہی زیادہ پسند آیا۔ ان کی اس رائے سے سو فی صدی اتفاق ہے کہ میڈیا خود احتسابی پر عمل نہیں کرتا اور اس سے بڑھ کر یہ کہ آج کا میڈیا معاشرتی قدروں اور تقاضوں کو ٹھوکر پر رکھتا ہے۔ انھوں نے بجا طور سے اس کی مذمت کی ہے کہ ڈی وی چینل بڑی ہی بے باکی اور بے خوفی سے انڈر گارمنٹس کی تشہیر کر رہے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ میڈیا ہمارے ملک کو بدترین قسم کی اخلاقی انا کی طرف لے جا رہا ہے۔

لیکن ''آپ کی بات'' میں ایک خط پڑھ کر بڑی تکلیف ہوئی کاش ایسی مسلم آزاد تحریر آپ کے موقر مجلے میں نہ شائع ہوئی۔

■ ڈاکٹر رضوانہ ارم، صدر شعبۂ اردو، جمشید پور ویمنس کالج، جمشید پور

اگست 2009 کا شمارہ آزاد کتاب گھر ساکچی سے دستیاب ہوا۔ اس رسالے نے فروغ اردو زبان کا حق اپنی علمی و ادبی کاوشوں سے ادا کر دیا ہے۔ اردو کے باذوق قارئین اس کی اپنی خوبیوں کی بنا پر اس کے شیدائی ہیں۔ ''ہمارا نظام تعلیم — اصلاح کا متقاضی'' اور ''اعلیٰ تعلیمی نظام میں تبدیلی — وقت کی ضرورت'' پر مغز اردو معلومات سے بھرپور مضامین ہیں۔ اداریہ اردو زبان و ادب سے شدید رغبت کا استعارہ ہے۔ ادب و صحافت کا گوشہ قابل قدر تخلیق کاروں کے زور قلم کا منھ بولتا ثبوت ہے۔ کلاسیکی ادب آج کے طلبہ و طالبات کی اہم ضرورت کے مدنظر بہت خوب ہے۔ غرض کہ لفظ لفظ جدید دور کے ادبی تقاضوں کی تکمیل کر رہا ہے۔ اہل اردو آج بھی اردو سے متعلق اپنے کیریئر کے تئیں سنجیدہ ہیں اور فکرمند بھی۔ مجھے کامل یقین ہے کہ آپ کی یہ ادبی کاوشیں بہت جلد اردو کو وسیلۂ روزگار بنانے اور ایک اعلیٰ ترقی یافتہ زبان کی حیثیت سے عالم میں متعارف کرائیں گی۔

■ اصغر شمیم، شعبۂ اردو، نواب بہادر انسٹی ٹیوشن، مرشد آباد، مغربی بنگال

ایک بار پھر آپ نے اپنی ادارت میں اردو دنیا کو سجانے اور سنوارنے کا کام شروع کر دیا ہے۔ مبارکباد قبول کریں۔ ماہ اگست کا شمارہ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی تمام مشمولات پسند آئے۔ آپ نے اردو دنیا میں کلاسیکی ادب کے لیے کچھ صفحے مخصوص کر دیے ہیں۔ یہ ایک لائق تحسین قدم ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ایک بار پھر آپ کی سرپرستی میں قومی اردو کونسل اردو کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے کی کوشش کرے گی۔

■ محبوب حسن، ماہی ہاسٹل، 33 جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی-67

رسالہ ''اردو دنیا'' ایک ایسا گلدستہ معلوم پڑتا ہے جس میں رنگ برنگے پھول پوری آب و تاب کے ساتھ کھلے ہوں۔ رسالہ ہمیں ادبی فکر و توانائی اور علمی غذا کے ساتھ ساتھ سماجی، سیاسی، اقتصادی، تہذیبی، تاریخی اور سائنسی علوم و فنون کے نت نئے رنگ و آہنگ سے روشناس کرانے لگا ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ سائنس کی برکتوں اور ایجادات نے انسانی زندگی کی تصویر کو نئے نئے رنگوں سے سجایا اور سنوارا ہے۔ انسان کی زندگی کو خوب سے خوب تر بنانے میں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے کارہائے نمایاں ناقابل فراموش ہیں۔ اس شمارے میں سائنسی و تکنیکی تجربات سے متعلق کئی اہم مضامین ہیں۔ اقبال محی الدین صاحب کا مضمون ''زراعت میں جنیٹکس کی اہمیت'' خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے ہماری عام زندگی میں جنیٹکس کی اہمیت و افادیت کو نہایت معروضی و مدلل انداز میں پیش کیا ہے۔ دراصل آج کے اس دور میں جنیٹکس سائنس کا ایک ناگزیر شعبہ بن چکا ہے۔ شمیم احمد صدیقی صاحب نے ''خود پروردہ قاتل'' میں پلاسٹک اشیا کے دور رس اثرات اور اس کے خطرات و نقصانات کو نئے انداز میں پیش کیا ہے۔ محمد اعجاز صاحب نے اپنے مضمون کے ذریعے سائنس کے ایک اہم گوشے پر نظر ڈالی ہے۔ انھوں نے ٹیکنیکل رائٹنگ کے حوالے سے جو گفتگو کی ہے اس سے کمپیوٹر کی صنعتی، سماجی اور اقتصادی اہمیت پر روشنی پڑتی ہے۔ مضمون کے آخر میں انھوں نے اپنے مفید مشوروں کے ذریعے ہماری رہنمائی بھی کی ہے۔ مضمون نہایت مختصر و کارآمد ہے۔ محمد خلیل صاحب کا ''روبوٹ۔ مشینی انسان'' دل کو بھا گیا۔ اس میں انھوں نے سائنس کی حیرت کن ایجاد یعنی روبوٹ کو دلچسپ طریقے سے متعارف کرایا ہے۔ انھوں نے روبوٹ کی قوت و توانائی، حرکت و عمل، عقل و فہم، انسانی زندگی میں اس کی اہمیت و افادیت کو باریک بینی کے ساتھ دکھلایا ہے۔ علاوہ ازیں اس کے نئے نئے امکانات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی اس

بے روح اولاد نے اولادِ آدم کی زندگی کو کتنا آسان بنا دیا ہے۔ روبوٹ کے اس مثبت رویے کے ساتھ ساتھ اس کے منفی پہلو پر بھی غور وخوض کرنے کی ضرورت ہے۔ مختصر یہ کہ سائنس اگر رحمت ہے تو بعض اعتبار سے زحمت بھی ہے۔

کلاسیکی ادب کے گوشے میں، قصہ جان عالم اور انجمن آرا کا پڑھ کر دل ودماغ کلاسیکی ادب کی سحر انگیزی پُر اسرار فضا میں کھو گیا۔ ضیاء الرحمٰن صدیقی صاحب نے ''آثار الصنادید'' کی تاریخی، تہذیبی اور ادبی قدر ومنزلت کو تحقیقی انداز میں بیان کیا ہے۔ ابوالکلام قاسمی صاحب نے اردو صحافت کے حوالے سے جو بحث کی ہے وہ بے حد پُرمغز اور معلوماتی ہے۔ اظہر راہی صاحب نے اردو حروف تہجی کے خاص مسئلے کو تحقیقی نوعیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ وقار صدیقی نے ظفر احمد نظامی کی تہہ دار و ہمہ گیر شخصیت اور ان کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ کہیں کہیں تشنگی کا احساس بھی ہوا کیوں کہ انھوں نے بعض اہم پہلو چھوڑ دیے ہیں نور پیکر صاحب کا ''ملا نصر الدین کا جبہ'' بھلا کسے پسند نہ آئے گا۔ محمد حسن اور شاہد اختر کے مضامین مہاراشٹر اور مغربی بنگال میں اردو تعلیم کی صورت حال کو بہتر طور پر پیش کرتے ہیں۔ ان سے ہمارے علم میں یقیناً اضافہ ہوا ہے۔ دیگر مضامین، خبریں اور تبصرے بھی ہماری فکری بصیرت میں اضافہ کرتے ہیں۔ ماہنامہ ''اردو دنیا'' اور اس کے متعلقین بالخصوص ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ کی خدمات کا ہم بھی قارئین کو اعتراف ہے۔

■ **شاہ عمران حسن، معرفت بک کاؤنٹر، پوسٹ باکس نمبر 9729، جامعہ نگر، دلی**

ماہ ستمبر 2009 کا شمارہ 4 ستمبر 2009 کو ملا۔ پڑھ کر کافی خوشی ہوئی۔ چند حقائق جاننے کا موقع ملا۔ ''اداریے میں آپ نے جس بات کا ذکر کیا ہے وہ سب ہندوستانیوں کے لیے ایک لمحۂ فکریہ ہے۔ اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ خالد محمود نے اپنے مضمون میں درست کہا کہ کسی زبان کے بولنے والے ہی اس کی زندگی اور ترقی کے ضامن ہوتے ہیں۔''

کرتار سنگھ کی تحریر شائع کر کے آپ نے فراخ دلی کا ثبوت دیا ہے۔ سارے مضامین دل چسپ اور معلومات میں اضافے کا باعث ہیں۔ فیروز بخت احمد نے مولانا ابوالکلام آزاد کی بیگم سے متعلق باتوں کو عوام کے روبرو پیش کر کے شکریہ کا موقع فراہم کیا ہے۔ میں عرصۂ دراز سے مجتبیٰ حسین کو پڑھتا رہا ہوں۔ اس بار ان کا مضمون تازہ شمارے میں دیکھ کر خوشی ہوئی تھی لیکن پڑھ کر بہت دکھ ہوا کہ انھوں نے ''ٹورانٹو میں تین دن'' میں ایک بھی کام کی بات درج نہیں کی ہے۔ ایک قاری کو اس میں کچھ بھی نہیں ملتا ہے۔

محمد شاہد پٹھان کی کتاب ''زرنقد'' شائع ہوگئی ہے۔ یہ جان کر خوشی ہوئی۔ محمد شاہد پٹھان سے ہمارے ذاتی تعلقات ہیں۔ وہ اچھی شاعری بھی کرتے ہیں اور گرانقدر مضامین بھی قارئین کو پیش کرتے ہیں۔

■ **قاسم بن ظہیر، 1658، آواس وکاس کالونی، جی ایس روڈ، ہاپوڑ**

ستمبر کا شمارہ پیش نظر ہے۔ مولانا آزادؔ اردو یونیورسٹی جیسی معتبر دانش گاہ سے وابستہ شخص کی غیر اخلاقی جرأت پر حیرت ہے، بچوں کے گوشے کے تحت نذیر احمد یوسفی کی جو کہانی ''چھوٹی سی بھول'' شائع ہوئی ہے، وہ دراصل مولوی اسماعیل میرٹھی مرحوم کی تالیف کردہ ''اردو زبان کی تیسری کتاب'' صفحہ نمبر-14 سبق نمبر-10 سے ماخوذ ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مولانا نے یہ حکایت اجمالاً بیان کی ہے اور نذیر صاحب نے تفصیل کے ساتھ ایک کردار کا اضافہ بھی کیا ہے اور اپنی طرف سے بھی کچھ باتیں بنائی ہیں۔ مولانا مرحوم نے سبق کے آخر میں یہ رباعی بھی لکھی ہے

جب تک کہ سبق ملاپ کا یاد رہا
بستی میں ہر ایک شخص دل شاد رہا
جب رشک وحسد نے پھوٹ ان میں ڈالی
دونوں میں ایک بھی نہ آباد رہا

یہ روایت اچھی نہیں ہے، اس قبیل کی بے ادبیوں سے احتراز لازم ہے، اس سے ادب کا وقار مجروح ہوتا ہے اور بے ادبی فروغ پاتی ہے۔

کرتار سنگھ کا خط لائق التفات ہے، ان کی ہر بات صحیح ہے نہ غلط، ان کے نزدیک کونسل کو جدید اصولوں پر چلنے کی ضرورت ہے ''جدید اصول'' کی وضاحت فرما دیتے تو بہتر ہوتا، مزید خامہ فرسائی کرتے ہیں: ''اردو دنیا میں صرف چند ہی لوگوں کے چند ہی شخصیات پر مضامین ہوتے ہیں جن سے عوام واقف نہیں۔'' اس ناواقفیت میں ''اردو دنیا'' کا کوئی قصور نہیں۔ ''اردو دنیا'' کے مضامین گھسے پٹے بھی نہیں ہوتے، معیاری ہوتے ہیں بس ان کی ذہنیت سے میل نہیں کھاتے۔ جہاں تک اس پرچے میں کشش اور انتظار کرانے کی قوت کی بات ہے تو مجھے تو بڑی شدت سے ''اردو دنیا'' کا انتظار رہتا ہے، اوروں کے بارے میں مجھے علم نہیں۔ ان کی باقی باتیں درست اور قابل عمل ہیں۔

''میں ''اردو دنیا'' کا مطالعہ گذشتہ کئی برسوں سے کرتا آرہا ہوں۔ ادھر آپ نے جو یہ کلاسیکل ادب کا سلسلہ شروع کیا ہے، عمدہ ہے اسے جاری رکھیے گا۔ عصری ادب کی کمی ضرور کھلتی ہے مناسب سمجھیں تو ادھر بھی دھیان دیں۔ آپ کے آنے سے رسالے کی بہتری میں اضافہ ہوا ہے۔

■ **ڈاکٹر محمد ناظم علی، صدر شعبۂ اردو، گری راج کالج، نظام آباد (A.P.)**

''اردو دنیا'' ستمبر 2009 کا شمارہ بروقت وصول ہوا۔ اردو دنیا پڑھنے کے بعد ہمیں یہ تاثر ملتا ہے کہ یہ رسالہ اپنے قارئین کو عصری شعور وآگہی عطا کرتا ہے۔ عصری رجحانات ومیلانات کا حامل رسالہ اردو والوں کے لیے ایک نعمت سے کم نہیں۔'' آپ کی بات'' کالم کے تحت جو خطوط شامل شائع ہوتے ہیں ان

سے رسالے کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اداریے میں نظام عدل کی جانب فکر انگیز اشارے کیے گئے ہیں۔ حقیقی مجرم کو سزا نہ ہونے سے جرائم کو فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ فیض نے کیا خوب کہا ہے بنے ہیں اہل ہوس مدعی بھی منصف بھی کسے وکیل کریں کس سے منصفی چاہیں۔ بڑے جرائم کی پشت پناہی سیاسی لوگ بھی کرتے ہیں ان شعبوں کو سیاسی عمل دخل سے محفوظ رکھنا چاہیے محمد احسن نے فاصلاتی نظام تعلیم کی اہمیت و افادیت کو مثالوں سے پیش کیا ہے۔ لیکن اس قسم کے نظام تعلیم میں معیار سوالیہ نشان بن جاتا ہے روایتی تعلیم میں جماعتوں کا اہتمام روزانہ ہوتا ہے لیکن فاصلاتی میں میعادی ہوتا ہے 30اور 24 گھنٹوں میں نصاب مکمل کیا جاتا ہے جبکہ ریگولر میں 210 دن میں نصاب مکمل ہوتا ہے۔ اگر معیار کو پیمانہ بنائیں تو دونوں میں بڑا تفاوت پایا جاتا ہے نظام تعلیم کی شناخت معیار کے پیمانے سے ہوگی نہ کہ پھیلاؤ سے۔ خالد محمود نے اردو اور اردو والوں کی ذمے داریوں پر اہم سوال اٹھائے ہیں اور تجاویز پیش کی ہیں۔ اردو والے اردو کی روٹی کھاتے ہیں اور انگریزی کے گیت گاتے ہیں اردو والوں کی نئی پود پوری طرح انگریزی کی طرف مائل ہوگئی ہے یہ المیے سے کم نہیں۔ احسان حسن نے اردو میں پی. ایچ. ڈی تحقیق کے مسائل پر کافی گہرائی سے روشنی ڈالی ہے انھوں نے موضوع کے انتخاب سے لے کر تحقیق کے دوران کی عملی دشواریوں کو اجاگر کیا ہے۔ اردو تحقیق نے اپنی رفتار تو تیز کر لی ہے لیکن معیار مفقود ہوگیا ہے کئی مقالے صرف حوالات و اقتصابات کا پلندہ ہوتے ہیں۔ تحقیق میں اسکالر کے ساتھ گائیڈ بھی حرکیاتی ہو وہ کماحقہ رہبری و راہنمائی کرے۔ کرتار سنگھ نے جو لکھا ہے اس پر میں تو یہ کہوں گا کہ ''اردو دنیا'' اپنا فرض بہ طریق احسن ادا کر رہا ہے۔ البتہ عورتوں اور بچوں کے ادب کو مزید فروغ دینے کی ضرورت ہے۔ کلاسیکی ادب ٹھیک ہے لیکن ان پر تعارفی نوٹ اور تبصرہ ہو تو اساتذہ اور طلبہ کے لیے استفادے کا باعث بنے گا۔ مسعود حسین خاں نے قومی یک جہتی اور ہندوستانی زبانیں میں بڑے معرکے کی بات کہی ہے کہ اگر ہند میں قومی یک جہتی کو زندہ و پائندہ رکھنا ہو تو ہندوستانی زبانوں خاص کر اردو کی بقا و ترویج کا کام کرنا ہوگا۔

■ کے. پی. شمس الدین ترورکاڈ، ملاپرم، کیرالا-679351

''اردو دنیا'' اکتوبر کا شمارہ ہر شمارے کی طرح بہت ہی شاندار رہا دوسرے مضامین کی طرح کیرالا کے ڈاکٹر کے. وی. نکولن کا مضمون بھی قابل مطالعہ تھا۔ لیکن ''آپ کی بات'' کالم میں ڈاکٹر کے. وی. نکولن کا مراسلہ ہماری سمجھ کے باہر تھا۔ انھوں نے ''میری زبان ملیالم ہے اور میں غیر مسلم ہوں'' کہہ کر پتہ نہیں کیا ثابت کرنا چاہا ہے۔ اردو زبان گنگا جمنی تہذیب اور مشترکہ تمدن کی نشانی ہے۔ یہاں مسلم اور غیر مسلم کہہ کر تفرقہ ڈالنے کی ضرورت نہیں ہے۔ نکولن صاحب کے نام سے ہی واضح ہو جاتا ہے کہ وہ غیر مسلم ہیں پھر اس طرح لکھنے کے کیا معنی ہیں۔ قارئین یہ سمجھیں گے کہ کیرالا میں غیر مسلم اردو داں صرف نکولن صاحب ہی ہیں۔ کیرالا میں صدیوں پہلے راجہ مہاراجہ (کیرالا کے راجہ مہاراجہ بھی غیر مسلم تھے سوائے کنور سلطنت کے راجہ کے) کے دور سے ہی غیر مسلم اردو سیکھتے آرہے ہیں۔ کوچین کے راجہ کے ترپونی ترا محل میں راجہ کے اہل خاندان کے لیے اردو تعلیم کا خاص انتظام تھا۔ یہاں ممبئی اور حیدرآباد سے اردو اساتذہ آیا کرتے تھے۔ جنھیں اردو منشی کے نام سے جانا جاتا تھا۔ ٹراونکور کے مہاراجہ کے سپہ سالار اور سرکاری افسران اردو سے واقفیت رکھتے تھے۔ جن میں غیر مسلم کے علاوہ دکنی مسلمان بھی تھے۔ وہیں کے راجہ سواتی ترونال اردو اور ہندوستانی موسیقی سے اچھی طرح واقفیت رکھنے والوں میں سے تھے۔ کیرالا میں مرزا غالب اور علامہ اقبال پر غیر مسلمانوں کی (ملیالم میں) تصانیف بھی موجود ہیں۔ کیرالا کے اردو اساتذہ میں تیس فیصد غیر مسلم ہیں۔ ان میں کسی نے بھی کبھی بھی اپنے آپ کو غیر مسلم کہہ کر تعارف کرانے کی کوشش نہیں کی ہے۔ کیرالا اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن اور انجمن ترقی اردو، کیرالا کی ریاستی کمیٹیوں میں بھی غیر مسلم موجود ہیں۔ جنھوں نے مسلم غیر مسلم کی بجائے ایک خاندان بن کر اردو کی ترقی و آبیاری کی یکساں کوشش کی ہے۔ اردو کسی مذہب یا فرقے کی زبان نہیں ہے بلکہ ہندوستانی مشترکہ تہذیب کی نشانی ہے۔ کیرالا میں پانچویں سے دسویں تک اردو درسی کتابوں کا مطالعہ کیجیے تو ان میں گنگا جمنی تہذیب دکھائی دے گی۔ اردو درسی کتاب تیار کرنے والی کمیٹی میں بھی غیر مسلم موجود ہیں۔ کیرالا اردو کونسل کی جانب سے اردو میلے کے اہتمام کے متعلق نکولن صاحب نے جو لکھا ہے بے شک ہم بھی ان کے خیال سے اتفاق رکھتے ہیں۔ لیکن یہ بات بھی ہمیں بھولنی نہیں چاہیے کہ کیرالا میں اردو کی ترقی و ترویج اور اردو خدمات میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نہایت اہم کردار ادا کر رہی ہے۔ NCPUL کی مالی امداد سے کیرالا میں کئی اردو سیمینار منعقد کیے گئے ہیں۔ یہاں کے کئی اسکولوں کی لائبریریوں کو NCPUL نے پانچ ہزار روپیوں کی مفت اردو کتابیں فراہم کی ہیں۔ کیرالا میں اردو کا ذوق و شوق بلاتفریق ہندو مسلم ''اردو دنیا'' کے مدیر ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ خود دیکھ چکے ہیں۔ جب وہ اردو اساتذہ کی انجمن ''کیرالا اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن'' کی ریاستی کانفرنس کے افتتاح کے موقع پر یہاں تشریف لائے تھے۔ کیرالا میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے دو اسٹڈی سینٹر ہیں' ایک کالی کٹ میں اور دوسرا کاسرگوڈ میں ہے۔ کالی کٹ اسٹڈی سینٹر میں باضابطہ طور پر ایم. اے (اردو)، بی. اے (اردو) کے کلاس چل رہے ہیں۔ یہاں سے ایم. اے (اردو) کامیاب ہونے والے طلبہ کی تعداد سو سے زائد ہے۔ لیکن کالی کٹ یونیورسٹی نے اب تک اسے مساوی کا درجہ نہیں دیا۔ کیرالا اردو ٹیچرس

ایسوسی ایشن کے عہدیداران اس معاملے میں کئی مرتبہ وائس چانسلر سے ملاقات کر چکے ہیں۔ مولانا آزاد نیشنل یونیورسٹی (حیدرآباد) کے وائس چانسلر نے خود یہاں آکر کالی کٹ یونیورسٹی کے وی.سی. سے ملاقات کی لیکن نتیجہ اب تک کچھ بھی نہیں نکلا جبکہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی پارلیمنٹ ایکٹ کے تحت قائم کی گئی ہے۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے ایم.اے. (اردو) اور دوسرے کورسز کے الحاق کے لیے یہاں تحریک اور احتجاج کرنا چاہیے۔ ایک طرف ہم اردو کی ترقی وترویج کے لیے بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں اور دوسری طرف اردو کا المیہ یہ ہے کہ ایم.اے (اردو) کامیاب ہونے والے طلبہ اپنے سرٹیفکیٹ کا کیا کریں سوچنے پر مجبور ہیں۔

□□□

ہندوستان کی تحریکِ آزادی اور اردو شاعری

مصنف: پروفیسر گوپی چند نارنگ

یہ کتاب اس تاریخی سچائی کو مدلل اور پرزور انداز میں سامنے لاتی ہے کہ اردو ہی وہ زبان ہے جس میں استخلاصِ وطن کی لڑائی پورے جوش و خروش کے ساتھ لڑی گئی اور جس کے نغموں اور نعروں نے دلوں کو وہ ولولہ اور دماغوں کو وہ بصیرت عطا کی جس کی قوم کو ضرورت تھی۔

صفحات:600، قیمت-/300روپے

تاریخ اور سماجیات

مصنفہ: عائشہ بیگم

تاریخ اور سماجیات، علم کے دو مختلف گوشے ہیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ تاریخ کا سب سے قریبی تعلق سماجیات سے ہے کیونکہ دونوں کا موضوع انسان، اس کا طرزِ عمل اور کردار ہیں۔ انسانی کردار کی داستان اس کے اخلاق وعمل اور آپسی تعلقات کی داستان ہے اور اخلاق وعمل کا انحصار بڑی حد تک ماضی کے تجربات پر بھی ہوتا ہے — اس کتاب میں اس بحث کو بڑی خوبی کے ساتھ سمیٹا گیا ہے۔ طرزِ بیان استدلالی اور علمی ہے۔

صفحات:140، قیمت-/51روپے

''اردو دنیا'' کے مضمون نگاروں سے گزارش

- بات پوری وضاحت سے کہیں لیکن عبارت آرائی سے گریز کریں۔
- ''اردو دنیا'' میں ایسے مضامین کی اشاعت کو ترجیح دی جاتی ہے جو عصری زندگی کے کسی اہم پہلو پر روشنی ڈالتے ہوں۔
- زبان آسان اور عام فہم استعمال کریں اور اختصار کو ملحوظ رکھیں۔
- بچوں کے کالم کے لیے کہانی یا مضمون کم سے کم 2000 الفاظ پر مشتمل ہو۔
- غیر طلبیدہ مضامین ناقابل اشاعت ہونے کی صورت میں تبھی واپس ہوسکیں گے جب ان کے ساتھ مناسب سائز کا ٹکٹ لگا لفافہ موصول ہو۔

—ایڈیٹر

ہماری بات

پچھلی صدی میں ہندوستان کی جن تین اہم شخصیتوں نے ہندوستان کی جنگ آزادی میں اور آزادی کے بعد اس عظیم ملک کی تعمیر نو میں اہم اور بنیادی کردار ادا کیا، ان کی ولادت نومبر کے مہینے میں ہوئی تھی، اس اعتبار سے اس مہینے کو ہماری قومی زندگی میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ ہندوستان کی پُر امن جنگ آزادی کے دو بڑے سپہ سالاروں مولانا ابوالکلام آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو کی ولادت بالترتیب اس مہینے کی 11 ویں اور 14 ویں تاریخ کو ہوئی تھی۔ آزاد 11 نومبر 1888 اور نہرو 14 نومبر 1889 کو پیدا ہوئے تھے۔ محترمہ اندرا گاندھی (ولادت 19 نومبر 1917) جو آزادی کے دوران عمر کی ابتدائی منزلیں طے کر رہی تھیں، اپنے والد کے لیے جذباتی حوصلہ مندی کا وسیلہ بنی رہیں اور وقت آنے پر آزادی کے بعد انھوں نے بھی ملک کی تعمیر نو میں جو کردار ادا کیا وہ ناقابلِ فراموش ہے۔

آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم کی حیثیت سے پنڈت جواہر لال نہرو نے ملک کی تعمیر نو کا جو پروگرام اپنے رفقائے کار کے مشوروں سے وضع کیا اس میں تین چیزوں کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ امور خارجہ میں، بیرونی ممالک بالخصوص ایشیائی ممالک اور اپنے پڑوسی ملکوں کے ساتھ پُر امن تعلقات اور ترقیاتی امور میں آپسی تعاون؛ داخلی سطح پر ملک میں آباد مختلف نسلی، مذہبی اور تہذیبی گروہوں کو ایک دوسرے کے قریب لانا اور ان میں خیر سگالی کے جذبے کو فروغ دینا نیز ایسی تعلیمی پالیسی کی تشکیل جو نئی نسلوں میں سائنسی مزاج پیدا کرے۔ ہندوستان قدیم سے ایک زرعی معاشرہ رہا ہے اور صنعت کے نام پر یہاں کچھ چھوٹی چھوٹی حرفتیں تھیں جن کی اہمیت آج بھی ہے لیکن بدلتی ہوئی دنیا میں عوام کی فلاح و بہبود اور ملکی معیشت کے استحکام اور فروغ کے لیے بڑی بڑی صنعتوں کا قیام ضروری تھا۔ پنڈت نہرو نے اس کی طرف خصوصی توجہ مرکوز کی اور کوشش کی کہ ہندوستان نہ صرف اپنی ضرورت کی اہم صنعتی اشیا خود تیار کرے بلکہ انھیں دوسرے ملکوں کو برآمد کرنے کی صلاحیت بھی پیدا کرے۔ پبلک سیکٹر میں فولاد سازی کے بڑے کارخانوں کا قیام اسی مقصد کے تحت کیا گیا۔ زراعت کو زیادہ بارآور بنانے پر بھی توجہ کی گئی اس کے لیے بھاکڑا ڈیم جیسے ڈیموں کی تعمیر کا سلسلہ شروع ہوا اور ان سے آبپاشی کی سہولتیں بڑھتی گئیں۔ ان سہولتوں کے خوشگوار نتائج سامنے آئے اور صنعتی محاذ کی طرح غذائی محاذ پر بھی نمایاں کامیابیاں حاصل ہوئیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے پہلے وزیر تعلیم کے طور پر زمام اقتدار سنبھالی اور ملک کے تعلیمی، تہذیبی اور ثقافتی احیا کا جو خاکہ تیار کیا وہ ان امور میں ان کی بے مثال بصیرت اور دوراندیشی کا مظہر تھا۔ انھوں نے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن، کونسل فار ایگریکلچر اینڈ سائنٹفک ریسرچ، کونسل فار میڈیکل ریسرچ، کونسل فار سوشل سائنس ریسرچ، کونسل فار کلچرل ریلشنز، ساہتیہ اکادمی، للت کلا اکادمی، سنگیت ناٹک اکادمی، سفارتی عملے کو بیرونی زبانیں سکھانے کا مرکز جیسے ادارے قائم کیے جن کی اہمیت اور افادیت روز افزوں ہے اور جن کی بدولت ملک کی ایک نئی شناخت بنی۔

محترمہ اندرا گاندھی کے کارناموں کی فہرست طویل ہے۔ ان کا ایک اہم کارنامہ مرکزی ترقی اردو بورڈ، جو اب قومی اردو کونسل کے نام سے کام کر رہا ہے اور مختلف صوبائی اردو اکادمیوں کا قیام تھا جس کا آغاز اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ کے قیام سے ہوا۔ اردو، ہندی کی طرح ہندوستان میں پیدا ہوئی یہیں پلی بڑھی اور پورے ملک میں سمجھی اور بولی جانے والی زبان ہے لیکن آزادی کے فوراً بعد یہ کچھ تعصبات کی زد میں آگئی تھی۔ ان تعصبات کو ختم کرنے اور اردو کو آزاد ہندوستان میں اس کا جائز حق دلانے کے لیے پنڈت نہرو بھی کوشاں رہے تھے جسے وہ اپنی مادری زبان بھی کہا کرتے تھے۔ ان کوششوں کو ایک واضح اور کارگر شکل محترمہ اندرا گاندھی نے دی۔ آج ملک کے 16 صوبوں میں اردو اکادمیاں موجود ہیں اور اپنے دائرۂ کار کی حدود میں رہتے ہوئے اردو زبان و ادب کے فروغ کا کام کر رہی ہیں۔

قومی اردو کونسل کا دائرۂ کار خاصا وسیع ہے۔ کلاسیکی ادب کی بازیافت، ہمعصر شعر و ادب کی قدر شناسی، کتابی میلوں اور موبائل وین کے وسیلے سے قارئین کو اردو کتابوں کی بہ سہولت رعایتی قیمتوں پر فراہمی، اردو اخبارات کے لیے یو این آئی سروس کے اخراجات کی کفالت، ہندی اور انگریزی میڈیم سے اردو کے مراسلاتی کورس کا اجرا، عربی اور فارسی زبانوں کے مراسلاتی کورس کا اجرا کہ ان دونوں زبانوں کے زیر سایہ اردو کی پرورش ہوئی ہے، ''فکر و تحقیق'' اور ''اردو دنیا'' جیسے رسائل کی اشاعت جو اردو والوں کے تمام حلقوں میں ذوق و شوق سے پڑھے جاتے ہیں اور ان سب کاموں پر مستزاد ملک کے طول و عرض میں ساڑھے تین سو اردو کمپیوٹر ٹریننگ سنٹروں کا قیام جہاں طلبہ اور طالبات کو کمپیوٹر کی روزگار مرکوز تربیت دی جاتی ہے۔

نہرو، آزاد اور اندرا جی کی پیدائش کے اس مہینے میں ہمارا فرض ہے کہ ملک و قوم کی فلاح و بہبود کے لیے ان کے آدرشوں کو ہم اپنے ذہنوں میں تازہ کریں اور اپنے قول و فعل سے ان کے خوابوں کو تعبیر دینے کی مخلصانہ کوشش کریں۔

□□□

شعیب اعظمی

نہرو اور آزاد کے تعلقات

آزاد اور نہرو ہندوستان کی ان عظیم اور تاریخی شخصیتوں میں شمار کیے جاتے ہیں جنھوں نے متحدہ اور جمہوری ہندوستان کی تشکیل میں ایک غیر فانی کردار ادا کیا ہے۔ یہ دونوں اس وجہ سے خوش قسمت بھی تھے کہ جب آزادی کی جنگ لڑی جارہی تھی تب بھی ان کے کاندھوں پر بڑی ذمے داریاں تھیں، وطن کے کاروان آزادی کے سپہ سالار تھے اور جب صدیوں بعد آزادی کی صبح طلوع ہوئی اور غلامی کا طوق وطن کی گردن سے الگ ہوا تو یہ دونوں شخصیتیں اس وقت بھی آگے رہیں۔ ان لوگوں نے آزادی کے اس قافلے کو آگے بڑھانے میں اسی جوش وخروش اور تگ ودو کا مظاہرہ کیا جو آزادی کے حصول کے لیے کیا تھا دونوں نے اپنی جدوجہد کے سامنے ذاتی مفاد کو بالائے طاق رکھ کر وقت کی رفتار کو محسوس کرتے ہوئے ہندوستان کے لیے نئی راہیں تلاش کیں۔ اپنی ان تھک اجتماعی کوششوں میں انھوں نے ہندوستانی عوام کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کی۔ پرانے قیود ورسوم توڑنے کے کام کے ساتھ ساتھ نئے مسائل سے نبرد آزما ہونے کا سبق بھی دیا۔ مذہبی تعصب، منافرت اور فرقہ واریت کے مصنوعی اصنام کو توڑنے کی تعلیم دی اور معاشی، اقتصادی اور قومی محاذوں پر مجاہدانہ عزم کے ساتھ آگے بڑھنے کی دعوت دی۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ دونوں نے جو راستے متعین کیے تھے وہی ہندوستان کے بنیادی مسائل کا اصل علاج تھے اور آج بھی ہیں۔ یہ چیزیں اس وقت زیادہ روشن ہوجائیں گی جب وقت یہ بتائے گا کہ ملک کی نجات اور فلاح، عصبیت، طبقہ واریت اور مذہبی منافرت سے علیحدہ ہٹ کر معاشی اور سماجی استحکام پیدا کرنے ہی میں ہے لیکن یہ دونوں اپنے مقاصد میں کس حد تک کامیاب رہے، کتنے دلوں نے ان کی دھڑکنیں محسوس کیں، اور کتنی زبانوں نے ان کی آواز پر لبیک کہا، اور کتنے قدم ان کے ساتھ بڑھے۔ اس کا جواب پانے کے لیے ہمیں وقت کے فیصلے کا انتظار کرنا ہوگا۔

نہرو اور آزاد کی تعلیم کیا تھی۔ دونوں ایک ہی مقصد کے لیے کوشاں کیوں تھے؟ اور دونوں اس محاذ اور معاملے پر ہم خیال کیوں تھے؟ اس کا جائزہ لینے کے لیے ہمیں تاریخ اور حالات کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔ تاریخی حالات یہ ثابت کرچکے تھے کہ جب بھی مذہب اور کلچر کا نعرہ لگایا گیا ہے اکثریت اور اقلیت کے درمیان خلیج وسیع تر ہوتی گئی ہے اور تیسری حکمراں طاقت نے ان کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر اپنے قدم اور مستحکم کیے ہیں۔ پھر وہ ملک جہاں اتنی رنگارنگی اور تنوع ہو کہ دنیا کے دوسرے ممالک میں اس قسم کی مثال زبان، لباس، مذہب اور تمدن کی بنیاد پر کم ملتی ہو۔ اس لیے ان دونوں نے وہ راہیں تلاش کیں جو ملکی مسائل کا صحیح حل تھیں۔ آزاد مشرقی کلچر کا دلدادہ، عربی، فارسی ادب اور اسلام کے علوم کا شیدائی ہونے کے ساتھ ساتھ حریت، آزادی اور ترقی کا طالب تھا دوسری طرف نہرو نئی تہذیب کا پروردہ، مادی تعلیم کا شاگرد، مغرب کی روح کا آشنا مگر ساتھ ہی ساتھ ہندوستان کے زمین وآسمان کا عاشق اور مشترکہ تہذیب کا بہترین نمائندہ بھی تھا۔ دونوں کے اندر اپنے مخصوص کلچر کی رواداری وضعداری اور خصوصیات کے ساتھ جدید علوم کی افادیت، آزادی کی قدر وقیمت اور ملک کے نجات کا خیال بدرجۂ اتم موجود تھا۔

اس مقصد کے لیے دونوں نے ایک ہی پلیٹ فارم کا انتخاب کیا جس پر آزاد پہلے آئے اور نہرو بعد میں دونوں ہی قلم کی شہسواری کے ساتھ ساتھ سیاست کے سمندر کے شناور بھی تھے اور آگے پیچھے آنے کے باوجود دونوں نے ایک دوسرے کی قدروقیمت کا اندازہ لگایا، ایک دوسرے کو پہچانا اور پھر آگے چل کر وہ تعلق قائم کیا جو صرف موت ہی ختم کرسکی۔ سخت ترین مسائل اور الجھنوں کے باوجود تعلقات میں ایک انوکھی شان رہی۔ ایک دوسرے کے ہم خیال ہونے کے ساتھ ایک دوسرے کے رفیق، ہمدرد اور عزیز رہے۔ بعض اوقات ایسے واقعات پیش آئے جب مولانا اور جواہر لال متفق نہ ہوتے مگر جب مولانا انھیں اپنا مدعا سمجھاتے تو وہ بات مان جاتے۔ مولانا آزاد نے جواہر لال کی بے مثال صلاحیتوں کی تعریف بھی کی ہے اور بڑے ہونے کے ناتے ان کی فروگذاشتوں اور خامیوں پر نکتہ چینی بھی کی ہے۔ اپنے تعلقات کے بارے میں مولانا اپنے اور جواہر لال کے بارے میں یوں لکھتے ہیں:

''میں نے جب سے کانگریس میں کام کرنا شروع کیا تھا جواہر لال کی اور میری بڑی اچھی دوستی رہی۔ ہمارے درمیان رقابت اور رشک کا سوال بھی پیدا نہیں ہوگا۔ دراصل ان کے خاندان سے میرے دوستانہ تعلقات پنڈت موتی لال نہرو کے زمانے سے تھے۔ شروع میں میں جواہر لال کو اپنے بڑے بھائی کا لڑکا سمجھتا تھا اور وہ بھی مجھے اپنے والد کا دوست سمجھتے تھے۔''

(ص 261 ہماری آزادی)

جب ان کے تعلقات کی ابتدا ہوئی ہے اس وقت یورپ کی جنگ عظیم میں ہندوستان کی شمولیت کا معاملہ درپیش تھا۔ مولانا آزاد اس کے سخت مخالف تھے جب کہ گاندھی جی کا ارادہ دوسرا تھا۔ اس وقت صرف جواہر لال ہی ایسے تھے جو مولانا کے ہم خیال تھے۔ اسی زمانے میں پہلی بار مولانا کانگریس کے صدر ہوئے۔ اب تک ورکنگ کمیٹی میں جس کے صدر راجندر پرشاد تھے جواہر لال کو شامل نہیں کیا گیا تھا۔ چنانچہ مولانا جواہر لال کو اپنی ورکنگ کمیٹی میں

واپس لائے۔

تعلقات کی استواری یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ چیانگ کائی شیک کی آمد اور ملاقات اور گفتگو میں دونوں کا ساتھ رہا۔ کرپس مشن کی تمام تر گفتگوؤں میں مولانا کے ساتھ جواہر لال رہے۔ جب کرپس کی تجویز پر آزاد نے ورکنگ کمیٹی میں اپنی رائے کا اظہار کیا تو ممبروں میں صرف جواہر لال تھے جنھوں نے مولانا کی تائید شدت سے کی۔ جواہر لال مولانا کی تجویزوں کو اس لیے بھی منظور کرنا چاہتے تھے کہ ایک تو چیانگ کائی شیک نے براہِ راست ان سے اپیل کی تھی اور دوسرے جواہر لال کی طبیعت ایشیا اور یورپ میں ہونے والے واقعات سے بے چین تھی جیسا کہ مولانا لکھتے ہیں:

''جواہر لال ان واقعات کی وجہ سے بہت بے چین تھے جو یورپ اور ایشیا میں رونما ہو رہے تھے اور انھیں ان جمہوری ریاستوں کے انجام کی بہت فکر تھی ان کی طبیعت انھیں ان سے ہمدردی کرنے پر آمادہ رکھتی تھی اور وہ چاہتے تھے کہ جہاں تک ہوسکے ان کی مدد کریں اس لیے ان کا رجحان کرپس کی تجویزوں کو منظور کرنے کی طرف تھا مگر انگریزوں کی مخالفت کا جذبہ ہندوستان میں اتنا شدید تھا کہ وہ اپنی بات صاف صاف اور اصرار کے ساتھ نہیں کرسکتے تھے لیکن میں ان کے دل کی بات جسے وہ زبان پر نہیں لاسکتے تھے اچھی طرح سمجھتا تھا اور مجموعی طور پر میں ان کا ہمدرد اور ہم خیال تھا۔

(ص-108، ہماری آزادی)

کرپس مشن سے متعلق جب نیوز کرانیکل میں جواہر لال کا انٹرویو شائع ہوا تو ایک نیا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا اور جواہر لال آل انڈیا ریڈیو سے کرپس مشن کی تجویز کو کانگریس ورکنگ کمیٹی کی نامنظوری کے بغیر براڈ کاسٹ کرانے والے تھے تو مولانا کو پریشانی لاحق ہوئی۔ چنانچہ انھوں نے نہرو سے کہا کہ اپنی ذاتی تقریر میں انھیں کمیٹی کے خلاف کچھ نہ کہنا چاہیے کیوں کہ ان کا بیان ورکنگ کمیٹی کے فیصلے کو رد کرسکتا ہے۔ پہلے جواہر لال نے حجت کی مگر مولانا کے اصرار پر تقریر نہ کرنے کا وعدہ کیا۔

اسی طرح کئی بار ایسا ہوا کہ مولانا انھیں اپنا ہم خیال بنانے میں کامیاب ہوجاتے تھے۔ وہ جواہر لال کی سیمابی کیفیت سے آشنا تھے چنانچہ جب پنڈت جی نے ورکنگ کمیٹی کے فیصلے کے خلاف اپنا بیان بدلا تو دوسری صبح مولانا، رامیشوری نہرو کے مکان پر نہرو سے ملنے گئے اور انھیں ایک گھنٹہ تک یہ بات سمجھاتے رہے کہ ان کا رجحان ہندوستان کے مفاد کے خلاف تھا۔ مولانا کی اس وضاحت پر کہ جنگ کے بعد دنیا کا رخ ضرور بدلے گا۔ آخر کار جواہر لال نے مولانا کو یہ یقین دلایا کہ میرا فیصلہ وہی ہوگا جو میرے ساتھیوں کا ہوگا۔

پھر اسی سلسلے میں جب 1942 میں انگریزوں کے مقابلے میں جاپانیوں کو ترجیح دینے کی بات آئی تو مولانا اس کے خلاف تھے اور ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک کے زور میں گاندھی جی اور سردار پٹیل جاپانیوں کے ہموار تھے۔ مگر مولانا یہاں لکھتے ہیں:

''جب میں نے اپنے خیالات کی وضاحت ورکنگ کمیٹی میں کی تو صرف جواہر لال نے میری تائید کی۔'' (ص158، ہماری آزادی)

ایک جگہ آگے چل کر وہ پھر لکھتے ہیں:

''جواہر لال اکثر مجھ سے اتفاق کیا کرتے تھے''

(ص158، ہماری آزادی)

ایک جگہ اور یہی بات کہتے ہیں کہ جب 1942 میں ان کی یہ تجویز تھی کہ جاپان کا استقبال نہ کیا جائے تو جواہر لال کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس زمانے میں وہ ہر معاملے میں گاندھی جی سے اتفاق نہیں کرتے تھے چنانچہ جب پوری ورکنگ کمیٹی کے ممبروں نے ایک خط میں مولانا سے استعفیٰ کی مانگ کی تو مولانا نے جواہر لال کو بلا کر وہ خط پڑھایا جواہر لال نے اس پر سخت صدمہ کا اظہار کیا اور کہا کہ اگر مولانا نے اور میں نے کانگریس کو چھوڑ دیا تو پارٹی کی بنیادیں ہل جائیں گی۔

ایسے واقعات اکثر پیش آئے کہ مولانا کے اصرار پر جواہر لال سوچنے پر مجبور ہوجاتے اور پھر ان کی بات مان لیتے وہ نہ صرف ان کو اپنا شریک کار سمجھتے بلکہ شفیق و معتمد بھی سمجھتے تھے۔ جب یہ لوگ احمد نگر لے جائے جارہے تھے مولانا اور جواہر لال ایک ہی ڈبے میں تھے۔ پونہ اسٹیشن پر عوام پر بے جا لاٹھی چارج ہونے پر جواہر لال جی ڈبے سے اتر گئے اور بے قابو ہوکر مجمع کی طرف بڑھے تو مولانا لکھتے ہیں:

''جواہر لال کھڑکی کے قریب بیٹھے تھے جوں ہی انھوں نے دیکھا کہ پولیس لاٹھی چارج کررہی ہے اور وہ ڈبے سے باہر کود پڑے اور چلاتے ہوئے آگے بڑھے کہ تمھیں لاٹھی چارج کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ پولیس کمشنران کے پیچھے لپکا اور انھیں ان کے ڈبے میں لانے کی کوشش کی، جواہر لال نے اس کا غصہ نہیں سنا اور غصہ میں باتیں کرنے لگے۔ میں نے جواہر لال سے پکار کر کہا کہ وہ اندر آجائیں۔ جواہر لال جو غصے سے بھرے ہوئے معلوم ہوتے تھے مگر میری درخواست کو قبول کرلیا۔''

کانگریس ورکنگ کمیٹی نے جن بنیادوں پر جنگ سے قبل مولانا کی مخالفت کی تھی، اب جب حالات بدلے تو اس کی موافقت پر تیار ہوگئی جب کہ مولانا اس کے برعکس سوچتے تھے چنانچہ اس وقت بھی ورکنگ کمیٹی کے اندر صرف جواہر لال ان کے خیالات سے اتفاق کرتے تھے۔ یہاں مولانا کہتے ہیں:

''مجھے یقین ہے کہ تاریخی اسباب اور نتائج کے سلسلے نے جواہر لال کی اور میری پوری پوری تصدیق کی ہے۔''

جواہر لال مولانا کا کس قدر خیال رکھتے تھے اس کا اندازہ الٰہ آباد اسٹیشن

کے حادثے سے لگایا جاسکتا ہے جب مولانا پلیٹ فارم پر پھسل کر گر پڑے تھے اور ان کا ٹخنہ زخمی ہوگیا تھا۔ ایسی حالت میں جواہر لال جی نے ان کا جو خیال رکھا، مولانا بڑے پُرخلوص انداز میں ان کو لکھتے ہیں:

''جب میں اپنے الہٰ آباد والے سانحہ پر غور کرتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کہ اگر یہ سانحہ کلکتہ میں پیش آیا ہوتا تو میرے یہاں کے اپنے عزیز میں میرے آرام وآسائش اور معالجے کے سلسلے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کرسکتے تھے جو الہٰ آباد میں کیا گیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ میرے عزیز ترین رشتہ دار بھی میرے لیے اس سے زیادہ سودمند ثابت نہ ہوتے جتنے تم میرے لیے الہٰ آباد میں تھے۔ میں نہیں جانتا کہ اپنے احساساتِ شکرگزاری کا اظہار کیوں کر کروں یقین کرو کہ میرا دل تمھاری مہر ومحبت کے لیے حد درجہ شکرگزار ہے۔''

(ص215، چند پرانے خطوط)

جواہر لال ان کی چھوٹی سی چھوٹی چیزوں کا کتنا خیال رکھتے تھے، مولانا کی زبانی سنیے:

''الہٰ آباد سے واپس آتے وقت تم نے میری راحت وآسائش کی چھوٹی جزوی باتوں کا لحاظ رکھا اور یہ اہتمام صرف ایک شب کے سفر کے لیے کیا۔ میں نہیں جانتا کہ کتنی چیزیں میرے ساتھ بھیجی گئی ہیں۔ یہاں پہنچ کر میں نے دیکھا کہ یوڈی کولون کی بھی ایک شیشی ٹوکری میں رکھ دی گئی تھی۔''

(ص216، چند پرانے خطوط)

مولانا کے صدارتی خطبے کا انگریزی ترجمہ جواہر لال نے کیا اور مولانا پڑھنے کے بعد اس کی داد دیتے ہوئے انھیں لکھتے ہیں:

''اس ترجمے نے مجھ پر جو اثر ڈالا ہے وہ مجھے مجبور کررہا ہے کہ میں اس وقت اپنے معتاد رکھ رکھاؤ کو دور پھینک دوں، اور تمھاری اول درجہ کی ذہانت اور تمھاری غیر معمولی صلاحیتوں کو اپنا پرخلوص خراج تحسین ادا کروں۔ .... انگریزی زبان پر تمھارے ماہرانہ عبور کی نسبت میرا جو اندازہ تھا اس سے وہ بہت آگے ہے۔ میں یہ کہنے کی جرأت کرسکتا ہوں کہ ہمارے عہد کے بعض قابل ترین اشخاص بھی جو عظیم الشان کام دنوں اور ہفتوں میں بھی بہ مشکل انجام دے سکتے تھے اس نے تمھارے صرف چند گھنٹے لیے اور وہ بھی بغیر کسی خاص سعی ومحبت کے۔''

(ص301، چند پرانے خطوط)

مولانا ان سے کافی بے تکلف ہوتے گئے اور اپنی پوری وضعداری کے باوجود ایک خط میں فرمائش کرتے ہیں۔ مولانا کو مسوری میں ٹھہرنے کے لیے ایک مکان کی ضرورت ہے۔ جواہر لال کو لکھتے ہیں:

''کیا تمھارے دوستوں میں سے کوئی صاحب مسوری میں میرے لیے ایک مکان کا بندوبست کرسکتے ہیں؟ اگر یہ صورت ممکن نہ ہو تو میں کرایہ دینے کو تیار ہوں۔ مکان بہرحال اچھا اور وسیع ہونا چاہیے۔ اگر تمھارے ذہن میں ایسے کوئی صاحب ہوں تو انھیں اس انتظام کے لیے براہ کرم تار دے دو۔''

(ص-304، چند پرانے خطوط)

مئی 1940 میں جب مولانا نینی تال میں مقیم ہیں تو جواہر لال کی رفاقت کے طالب ہیں۔ لکھتے ہیں:

''کیوں نہ تم نینی تال چلے آؤ اور چند دن میرے ساتھ یہاں قیام کرو۔ تم یہاں بیٹھ کر پلاننگ کمیٹی کی ترتیب کا کام انجام دے سکتے ہو، جہاں تک صوبائی کام کا تعلق ہے تم نینی تال اور الہٰ آباد میں کوئی فرق نہ پاؤ گے، مزید برآں تمھارا یہاں موجود ہونا بہت سے معاملات میں تم سے فوراً مشورہ لینے میں مفید ثابت ہوگا۔''

(ص315، چند پرانے خطوط)

آزاد ساتھ ہی ساتھ اپنی بے نیازی اور محبت کا ثبوت بھی دیتے ہیں۔ ایک موقع پر ان کو لکھتے ہیں:

''دہلی سے جو تار تم نے مجھے دیا اور جو خط مجھے لکھا اس کا میں شکریہ ادا کرتا ہوں۔ از راہِ کرم اس بات کو نوٹ کرلو'' میں شکریہ ادا کرتا ہوں'' کہا ہے محض شکریہ نہیں کہا ہے۔''

(ص391، چند پرانے خطوط)

نہرو کی صحت کا انھیں بہت خیال تھا۔ چنانچہ مئی 1942 میں ان کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''تم کولو میں جتنے زیادہ دن ٹھہرو گے مجھے اتنی ہی زیادہ مسرت ہوگی۔ الہٰ آباد میں تمھیں پژمردہ اور دل گرفتہ دیکھ کر مجھے بڑی فکر لاحق ہوگئی تھی۔ اب یہ بات مان لینی چاہیے کہ تم پچاس سال پورے کرکے آگے بڑھ رہے ہو اور تمھیں اپنی صحت کا کسی قدر زیادہ فکر رکھنا چاہیے۔''

(ص392، چند پرانے خطوط)

مگر ان دنوں کے آپس کے خلوص اور رکھ رکھاؤ کے تعلق دوسروں کے لیے باعث رشک ونفرت بھی بن گئے تھے۔ اس کے اثرات بعض اوقات خود جواہر لال پر بھی پڑتے تھے۔ اس کا اظہار مولانا اپنے ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''جواہر لال کی طبیعت میں محبت اور فیاضی ہے اور وہ رشک کے جذبے سے نا آشنا ہیں۔ ان کے عزیزوں اور دوستوں میں بعض لوگ تھے جن کو ہمارے تعلقات پسند نہیں تھے اور جو چاہتے تھے کہ ہمارے درمیان غلط فہمیاں اور رشک ورقابت کرادیں؟''

(ص261، ہماری آزادی)

ان اختلافات کی پہلی جھلک سیاسی میدان میں سبھاش چندر بوس کے زمانہ صدارت میں مختلف وجوہ کی بنا پر دیکھی جاسکتی ہے۔ ایک خط میں سبھاش نہرو کو لکھتے ہیں:

''جب مولانا آزاد دوبارہ انتخاب کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو تم ان کی شان میں ایک طویل قصیدہ لکھنے میں پس وپیش نہیں کرتے۔''

(ص131، چند پرانے خطوط)

سبھاش ایک اور جگہ نہرو کو طنزاً لکھتے ہیں:

''مجھے بتایا گیا ہے کہ جب تم دہلی میں تھے تب تم نے مہاتما گاندھی تک یہ پیغام پہنچایا کہ مولانا آزاد سے ملنے کے لیے انھیں الٰہ آباد جانا چاہیے۔ ممکن ہے کہ یہ اطلاع بالکل بے بنیاد ہو لیکن اگر یہ غلط نہ ہو تو کیا تم نے مہاتما گاندھی سے یہ بھی کہا کہ وہ وھنباد بھی جاسکتے ہیں۔'' (ص-153، چند پرانے خطوط)

آگے چل کر تعلقات کی کشیدگی کا اثر بھی پڑا۔ چنانچہ ممبئی کی ورکنگ کمیٹی میں جواہر لال نے مولانا کی ہر تجویز کی کھل کر مخالفت کی۔ مولانا کو اس بات کا دکھ تھا کہ یہ سب کچھ جواہر لال کو بہکا کر کیا گیا ہے۔ مولانا نے پنجاب میں کانگریس کی اقلیت ہونے کے باوجود وزارت سازی کے لیے تیار کرلیا مگر ورکنگ کمیٹی میں مخالفت کا رخ دیکھ کر مولانا نے کہا کہ اگر ان کا فیصلہ لوگوں کو منظور نہیں ہے تو کمیٹی اپنا فیصلہ اختیار کرسکتی ہے۔ گاندھی جی نے تجویز کی موافقت کی اور جواہر لال بھی آخر کار مان گئے۔ مولانا اپنے تاثرات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

''جواہر لال کو شاید اس کا خیال تھا۔ میں حسب معمول بھولا بھائی ڈیسائی کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ دوسرے دن جواہر لال صبح وہاں آئے اور مجھ سے اظہار معذرت کرتے ہوئے کہا کہ مخالفت کا مقصد آپ کی قیادت سے اختلاف نہیں ہے اور یہ کہا کہ ہم دونوں اس واقعہ کو بھول جائیں۔ مجھے اس بات کا دکھ تھا کہ ہم دونوں کے درمیان غلط فہمی ہوگئی تھی۔'' (ص263، ہماری آزادی)

اس کے باوجود بھی بارہا ایسا ہوا کہ جواہر لال سے کسی بات پر مولانا نے اصرار کیا اور وہ مان گئے۔ جب مولانا کے منع کرنے کے باوجود جواہر لال جی کشمیر کے دورہ پر گئے اور مہاراجہ کی حکومت نے وہاں انھیں گرفتار کرلیا تو مولانا کو سخت پریشانی ہوئی۔ مولانا نے جواہر لال کو ٹیلیفون کیا کہ وہ دہلی چلے آئیں مگر نہرو پہلے بضد رہے اور بعد میں مولانا کے اصرار پر واپس آنے کے لیے تیار ہوگئے۔ مولانا نے لارڈ یول سے مل کر ان کے لیے ایک خاص ہوائی جہاز کا انتظام کرایا جو انھیں کشمیر سے دہلی لایا۔

مولانا، نہرو پر اپنا حق سمجھتے تھے اور ان کا اتنا خیال رکھتے تھے کہ جب تقسیم ہند کے وقت کانگریس کی صدارت کا سوال آیا تو گاندھی جی نے سردار پٹیل کو صدر بنانا چاہا لیکن مولانا نے جواہر لال کو اپنا جانشین بنایا چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں:

''جب ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ ہوئی تو میں نے جواہر لال سے کہا کہ وہ کرسی صدارت پر بیٹھیں۔

چنانچہ سردار نے شکریہ کی تجویز پیش کی۔'' (ص310، ہماری آزادی)

پھر بھی اس کے باوجود جب بھی جواہر لال سے کوئی فروگذاشت ہوئی تو مولانا نے ان پر سخت تنقید کی ممبئی کی پریس کانفرنس میں جب جواہر لال نے ورکنگ کمیٹی کے پلان سے متعلق تجویز کے برعکس بیان دیا تو مولانا کہتے ہیں:

''میں یہاں صاف صاف لکھ دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ جواہر لال کا بیان غلط تھا۔'' (ص314، ہماری آزادی)

مشن کی ناکامیابی کی ذمے داری مولانا جواہر لال پر بھی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں:

''جواہر لال میرے عزیز ترین دوست ہیں۔ انھوں نے ہندوستان کی قومی زندگی کو ترقی دینے میں کسی سے کم حصہ نہیں لیا ہے۔ انھوں نے ہندوستان کی آزادی کے لیے محنت کی ہے اور تکلیفیں اٹھائی ہیں، اور آزادی کے بعد وہ ہمارے قومی اتحاد اور ترقی کی علامت بن گئے ہیں پھر بھی مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ کبھی کبھی وہ اپنے جذبات کی رو میں بہہ جاتے ہیں۔ یہی نہیں بسا اوقات معاملوں کے خالص نظری پہلو سے اس درجہ متاثر ہوتے ہیں کہ واقعی صورت حال کا صحیح اندازہ نہیں کرپاتے۔'' (ص324، ہماری آزادی)

ان دونوں کے تعلقات کی تاریخ میں بارہا ایسے موڑ آئے جب کہ دونوں کے نظریات اور نقطۂ عمل میں فرق رہا۔ صوبہ سرحد کا دورہ کرنے کے لیے مولانا نے نہرو کو منع کیا کہ وہ وہاں نہ جائیں مگر نہرو وہاں گئے اور ان مشکلات سے دوچار ہوئے جن کا علم مولانا کو تھا مگر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ جب مولانا تن تنہا رہ گئے اور وہ مسئلہ تقسیم ہند کا تھا۔ یوں تو گاندھی جی اور سردار پٹیل بھی تقسیم پر تیار ہوگئے تھے مگر جب مولانا کے اصرار اور بار بار گفتگو کرنے کے باوجود نہرو بھی تقسیم سے متفق ہوگئے تو وہ خاص طور سے لکھتے ہیں:

''جواہر لال بااصول آدمی ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ جذباتی بھی ہیں اور اشخاص کا اثر قبول کرتے ہیں۔ ان پر سردار پٹیل کی دلیلوں کا اثر ضرور ہوا ہوگا۔ مگر یہ فیصلہ کن نہ ہوسکتا تھا۔ جواہر لال ماؤنٹ بیٹن سے بہت متاثر تھے اور شاید ان سے بھی زیادہ لیڈی ماؤنٹ بیٹن سے۔'' (ص369، ہماری آزادی)

مولانا کی شخصیت ایک زمانے سے نزاع کا باعث بن گئی تھی۔ ایک دور ایسا بھی آیا کہ دوسروں پر بھی یہ بات واضح ہوگئی تھی۔ ماؤنٹ بیٹن کے پریس اتاشی کیمبل جانسن کا ایک اقتباس خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ وہ لکھتا ہے:

''مولانا آزاد جن کی علمیت اور قابلیت میں کوئی کلام نہیں گذشتہ دس سال سے نزاعی شخصیت بنے ہوئے ہیں۔ آپ ممتاز کانگریسی مسلمان ہیں اور زمانہ جنگ تک کانگریس کے صدر رہ چکے ہیں کرپس اور کیبنٹ مشن میں آپ نے نمایاں کردار انجام دیا ہے۔ آپ کی شخصیت اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ آپ فرقہ وارانہ جماعت میں شرکت کرنے کے بجائے قوم پرست رہے۔ گاندھی اور جناح کے درمیان ان کی شخصیت باعث نزاع رہی۔ جناح ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ مسلمانوں کے مفادات کی نمائندگی مسلم لیگ کے علاوہ اور کوئی نہیں کرسکتا۔''

(ص320، عہد لارڈ ماؤنٹ بیٹن)

کیمبل جانسن آگے چل کر ایک خاص واقعہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

ملاحظہ ہو۔

''نہرو اور پٹیل کے درمیان اختلاف کا سبب وزیر تعلیم مولانا آزاد ہیں۔ مولانا آزاد نے مشہور سائنسداں بھٹناگر کو اپنی وزارت کا پرنسپل سکریٹری اس ذیلی کمیٹی کے مشورے کے بغیر کردیا تھا۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے بارے میں مختلف خیالات پائے جاتے ہیں۔'' (ص 327، عہد لارڈ ماؤنٹ بیٹن)

چنانچہ کانگریس کے دو گروہوں میں یہ نزاعی مسئلہ رہا کہ ایک جواہر لال اور مولانا کا ساتھ دیتا تھا اور دوسرا سردار پٹیل وغیرہ کا۔ اس کا اندازہ مولانا کے اس اقتباس سے بھی ہوجائے گا۔

''سچ تو یہ ہے کہ میرا رویہ اور جواہر لال کا رویہ سردار پٹیل کے رویہ سے مختلف تھا۔ چھوٹے گروہ کی نظریں میری اور جواہر لال کی طرف اٹھتی تھیں اور یہ دوسرا گروہ جواہر لال کے احکام بجالانے کی کوشش کرتا تھا۔''

(ص، ہماری آزادی)

تقسیم کے بعد وزارت میں مولانا بھی آگئے اور دونوں کا قیام دہلی میں ہوگیا اور خط و کتابت کے بجائے اب ذاتی ملاقاتوں میں تعلقات بدل گئے تھے۔ ہندوستان کی فضا فرقہ واریت کی وجہ سے مسموم تھی۔ مولانا پریشان تھے کہ ایسے ناسازگار حالات میں کیا ہوسکتا ہے۔ ان کے خیال میں تقسیم کے بعد سوائے جواہر لال کے تمام ذہن متاثر ہوگئے تھے اور ایسے میں جواہر لال کا دم غنیمت سمجھتے تھے۔ اب ان بدلے ہوئے حالات میں وہ جواہر لال کے بارے میں لکھتے ہیں:

''1946-47 کے ہولناک زمانے میں جواہر لال نے ایک سچے حاکم کی ان صلاحیتوں کا بہت نمایاں ثبوت دیا جس روز سے انھوں نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی انھوں نے محسوس کرلیا کہ حکومت کو شہریوں کے درمیان کسی قسم کی تفریق نہیں برتنی چاہیے اور ہر ایک کے ساتھ خواہ وہ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی یا بدھ ہو یکساں برتاؤ کرنا چاہیے۔ قانون کی نظر میں ہندوستان کے ہر شہری کا حق برابر ہے۔'' (ص 424، ہماری آزادی)

بہار کے فسادات میں مولانا اور نہرو وہاں موجود تھے۔ ایسے حالات میں وہ ایک بار پھر ان کی صلاحیتوں کے معترف ہیں:

''میں ان دنوں تقریباً دو ہفتہ پٹنہ میں رہا جس سختی اور قوت کے ساتھ جواہر لال نے ان فسادات کی روک تھام کی میں اس سے بہت متاثر ہوا۔ یوں تو ہم سب ایک ہی مقصد کے لیے کوشاں تھے لیکن بلاشبہ اس میں سب سے موثر کارگزاری جواہر لال کی تھی۔'' (ص 424، ہماری آزادی)

آزادی کے بعد نئے مسائل اور الجھنیں سامنے آئے اور دونوں اسی جوش و خروش کے ساتھ ان سے نبرد آزما ہوگئے۔ دونوں ایک ہی منزل کی طرف گامزن تھے مگر مولانا کا دل بجھ سا گیا تھا۔ قویٰ ہی شل نہیں ہوگئے تھے بلکہ سب سے زیادہ اثر ان پر تقسیم نے ڈالا تھا۔ مولانا کے بھانجے یوسف علی اس رات کا بیان کرتے ہیں جس رات تقسیم کا اعلان ہوا:

''جس رات ہندوستان کی تقسیم ہونے والی تھی تو بڑی رات تک مولانا پریشانی کی حالت میں اپنے برآمدے میں ٹہلتے رہے۔ میں دہلی میں تھا اور ان کی یہ حالت دیکھ کر رات بھر جاگتا رہا۔ آخر ریڈیو سے ہندوستان کی تقسیم کی خبر نشر کردی گئی۔ مولانا بھک بھک کر رو دیے۔ پھر میرے دونوں کندھوں کو جھنجھوڑتے ہوئے بولے۔ یوسف یہ بہت برا ہوا۔ ہم نے اپنے ہی ہاتھوں اپنی اولاد کے لیے مصیبتوں کے بیج بو دیے ہیں اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا اور میں بڑی رات تک ان کے کمرے سے ہچکیوں کی آواز سنتا رہا۔

(ہندی سے لیا گیا)

مولانا آزاد نے جن اصولوں کی لڑائی لڑی تھی اس میں ان کو شکست ہوگئی تھی۔ وہ ویسے تو ورکنگ کمیٹی اور وزارت کے معاملات میں دل چسپی لیتے تھے مگر وہ پہلا سا جوش و خروش باقی نہ رہ گیا تھا۔ کیمبل جانسن ایک جگہ ان کی حالت کا نقشہ یوں پیش کرتا ہے:

''منگل 16 ستمبر 1947 جب تک یہ میٹنگ ہوتی رہی کانگریس کے پرانے لیڈر مولانا آزاد حسب معمول خاموش اور بے حس بیٹھے کارڈنیل ریچیلیو کی طرح خلا میں گھورتے رہے۔'' (ص 251، عہد لارڈ ماؤنٹ بیٹن)

عام زندگی سے انھوں نے اپنے آپ کو علیحدہ کرلیا تھا یہاں تک کہ وہ عام انتخاب میں اپنے حلقہ انتخاب تک میں نہ گئے مگر ان کی شخصیت کا اثر اب بھی لوگوں پر قائم تھا۔ جواہر لال میوات کے حلقے میں خود گئے اور مولانا کے حق میں تقریریں کیں اور کہا کہ وہ ہمارے مشترکہ دور کی بہترین اور بے مثال ہستی ہیں۔ نہرو پر ان کی موت کا خاصا اثر تھا اس لیے کہ ملکی مسائل کا چھوٹے سے لے کر بڑا ہر مسئلہ ان کے مشورہ کے بغیر طے نہ ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ چھاگلا کمیشن کے فیصلے کو مولانا کی آخری رائے ہی نے قابل عمل بنایا۔

یوسف علی کہتے ہیں کہ جب مولانا کے انتقال کے بعد میں پنڈت نہرو سے ملا تو وہ رو دیے۔ انھوں نے مولانا آزاد کا اور اپنا ایک فوٹو دستخط کرکے دے دیا اور کہا مولانا کے ساتھ اپنی یہ آخری یادگار میں تمھیں سونپتا ہوں۔

آج دونوں اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن سیاسی میدان میں ان دونوں کے تعلقات کی تاریخی حیثیت ہمیشہ برقرار رہے گی۔ ہندوستان کے اس بحرانی اور ابتلا کے دور میں ان دونوں کی یاد آتی ہے۔ کاش موجودہ نسل ان دونوں کے نظریات اور خیالات کو اپنا کر اپنا راستہ تلاش کرسکتی!

□□□

منی بھوشن کمار

مولانا آزاد کی نگاہ میں عورتوں کا مقام

مولانا آزاد جدید ہندستان کے اُن معماروں میں ہیں جنھیں سیاسی، سماجی، تعلیمی اور فکر وخیال کے اَن گنت شعبوں میں ملک کو آگے بڑھانے کا موقع حاصل ہوا۔ جنگِ آزادی کے نازک موڑ پر وہ کانگریس میں شامل ہوئے اور اپنی قائدانہ صلاحیتوں کے سبب ملک کے ممتاز رہنماؤں میں ان کا شمار ہونے لگا ہے۔ غلامی سے نجات کی جدوجہد میں وہ ہرلمحہ چاق وچوبند رہے اور آزادی کے بعد ہندستان کی تعلیم نو کا خاکہ تیار کرنے کی ذمے داری ان کے کاندھوں پر آئی۔ مولانا صرف ایک ماہر سیاست داں نہیں تھے۔ قومی تحریک میں شامل ہونے سے پہلے وہ اپنی اعلا

صحافتی خدمات کی وجہ سے ملک کے گوشے گوشے میں اپنی شناخت قائم کر چکے تھے۔ اپنی دینی بصیرت کے لیے وہ ہندستان اور ہندستان سے باہر بھی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ وہ اردو کے بہترین انشاپرداز اور بے مثل خطیب کی حیثیت سے بھی انھیں جانا جاتا تھا۔ وہ سب سے کم عمر میں انڈین نیشنل کانگریس کے صدر ہوئے اور لگاتار چھ برسوں تک اس ممتاز عہدے پر فائز رہے۔ ہندستان کے عالموں نے انھیں 'امام الہند' کا خطاب دے کر اُن کی مذہبی قیادت کو بھی تسلیم کیا۔

ایک ساتھ ادب، صحافت، مذہب، سیاست جیسے شعبوں میں نمایاں کامرانی کی وجہ مولانا آزاد کی وہ فکری پختگی ہے جس نے انھیں کئی متضاد اور متخالف محاذوں پر اپنی اہمیت ثابت کرنے کا موقع دیا۔ مولانا آزاد کے ذہن میں ہندستانی سماج کا ایک واضح خاکہ تھا۔ انھیں معلوم تھا کہ جدید ہندوستان کو کن راستوں پر چل کر اپنی کامرانیاں تلاش کرنی ہیں۔ مولانا نے ہر بدلتے ہوئے نقش پر اپنی توجہ مبذول کی اس لیے انھیں افکار ونظریات کی دنیا میں تبدیلیوں کی نہ صرف دوسروں سے پہلے خبر رہتی تھی بلکہ خود کو بدل کر نئی روشنی کا منبع کس طرح وہ بن سکتے ہیں، اس کا واضح تصور اُن کے پاس تھا۔ یہ اتفاق ہے کہ مولانا کی عظمت اور اہمیت کو سمجھنے کے باوجود اُن کے افکار کے چھوٹے چھوٹے گوشوں پر توجہ نہیں دی گئی۔ اس لیے آج ضرورت اس بات کی ہے کہ مولانا کے افکار ونظریات کے پوشیدہ گوشوں پر غور وفکر کیا جائے اور اُن کے خاص خاص نشانات واضح کیے جائیں۔

بیسویں صدی کے بعض مسائل کے متعلق مولانا کے تصورات کو جاننا دل چسپی سے خالی نہیں۔ انگریزی تعلیم، گیت سنگیت اور ڈراما، سائنس اور ٹکنالوجی کا فروغ، جدید معاشرے میں عورتوں کے مسائل اور اُن کے حل کے لیے اہتمامات جیسے امور پر مولانا کے نقطۂ نظر پر غور وفکر سے اُن کے نظریات واضح ہو سکتے ہیں۔ ہم اس مضمون میں مولانا آزاد کی نگاہ میں عورت کے مقام کی بابت گفتگو کریں گے۔

زمانۂ قدیم میں ہندوستان مادرانہ نظام کے تحت تھا۔ عورت نے چوں کہ تخلیق کی عظیم ذمے داری اٹھائی ہے، اس لیے اُس کی مرکزیت کے تئیں سماج کا جھکاؤ فطری تھا۔ جب عورت مالک ومختار تھی تو اس کے ساتھ بے انصافیوں کا سوال یوں بھی نہیں اُٹھتا۔ لیکن تہذیب وتمدن کے ارتقا کے ایک مرحلے میں جب کاشت کاری کا آغاز ہوا تو نظامِ کاشت نے سماج میں عورتوں کے مقابلے میں مردوں کی طاقت کو استحکام بخشا اور رفتہ رفتہ سماج کی زمام عورتوں کے ہاتھ سے نکل کر مردوں کے ہاتھ میں چلی آئی۔ ترقی کی اس پہلی کروٹ نے ہی پدری نظام کو، ایسی مضبوطی دی جس کا کوئی مداوا کئی ہزار برسوں میں بھی تلاش نہ کیا جاسکا۔ عورتیں دیکھتے دیکھتے محکوم ہوگئیں اور سماج کی قیادت کے مورچے سے وہ پچھلے دروازے تک پہنچ گئیں۔ عورتوں کی غلامی کا نقطۂ عروج ہم عرب کے اُس جاہلی سماج میں دیکھتے ہیں جہاں لڑکی کو پیدا ہوتے ہی زمین میں گاڑ دیا جاتا تھا۔

صنعتی انقلاب نے جب یورپ کو ترقی اور خوش حالی کے نئے راستے دکھائے۔ اُس کے پہلے دنیا کے ہر خطے میں عورتیں ایک غیر ضروری اور ستائے جانے والی مخلوق بنی ہوئی تھیں۔ صنعتی انقلاب کے نتیجے میں حالانکہ عورتوں کے لیے سہولت کا کوئی علاحدہ بندوبست نہیں ہوا لیکن مذہبی سماج نے عورتوں کو جو زنجیریں پہنائی تھیں، ان کو اس انقلاب نے تھوڑا ڈھیلا کیا اور کارزارِ حیات میں اپنے حصے کی زمین تلاش کرنے کے لیے تھوڑی سہولت انھیں عطا کی۔ عورتیں تعلیم سے اتنی دور تھیں کہ اس انقلاب نے بھی ایک دن میں ان کی کایا نہیں پلٹ دی۔ انھیں دھیرے دھیرے آگے بڑھنے کا راستہ ملا۔

انیسویں صدی کے اواخر میں ہی برطانوی نوآبادیت پر ضربیں پڑنے لگیں اور دنیا جمہوریت کے پھیلاو میں سرگرمِ عمل نظر آنے لگی۔ تعلیم کے یکساں مواقع اور برابری کے لیے جذبات ابھرنا شروع ہوئے۔ اسی دوران فلسفۂ اشتراکیت نے جنگوں کی ماری ہوئی دنیا کو معاشی برابری کا پیغام دیا اور ایک نئے نظام کی آمد آمد کا سورج طلوع ہونے لگا۔ جنس اور معیشت دونوں آزادیوں

نے اس دنیا کو جو نیا خواب دیا، اُسی نے خواتین کو پدری نظامِ کائنات میں ایک کارگر رول انجام دینے کا موقع دیا۔

ایسے ہی موڑ پر مصر میں فرید وجدی کی عربی کتاب ''المراۃالمسلمۃ' ' آئی جس میں عورتوں سے متعلق کئی سوالوں کو بالکل نئے خیالات کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی گئی تھی۔ مذہب اور اخلاق کی نئی توضیحات کی روشنی میں ان کے جوابات بھی دیے گئے تھے۔ مولانا آزاد نے اس کتاب کا اردو ترجمہ کیا اور اس پر ایک عالمانہ مقدمہ لکھا۔ اس میں وجدی کے حوالے سے چند سوالوں پر بحث کرتے ہوئے وہ عورتوں کی بہتری کے موضوع پر اپنے خیالات بھی مختصراً رقم کردیتے ہیں۔ مولانا آزاد 'قدیم تعلیم کی یادگار' اور 'نئی تعلیم کے تربیت یافتہ' دو گروہوں کی درمیانی حدِ فاصل کو نظر میں رکھتے ہیں اور اپنے مقدمے میں ان دونوں گروہوں کے حوالے سے بحث کو آگے بڑھاتے ہیں:

''نئے گروہ نے جس قدر پردے اور قید کی خرابیاں دکھائی ہیں، وہ خود نہیں دکھائی ہیں بلکہ یورپ کے اثر میں محیط ہوکر دکھلائی ہیں۔ یورپ کے رعب نے اس طرح انھیں دم بخود کردیا ہے کہ ایک لفظ بھی اس کی مخالفت میں نہیں کہہ سکتے۔''(1)

''جن لوگوں نے پردے کی تائید میں رسالے لکھے ہیں، ان میں بڑی جماعت قدیم تعلیم یافتہ لوگوں کی ہے۔ چوں کہ ان لوگوں کی نظروں سے یورپ کا حال پوشیدہ ہے، اس لیے جو کچھ لکھتے ہیں، مذہب کے بل پر لکھتے ہیں اور مذہب ہی ایک ایسی چیز ہے جس کا جادو نئے گروہ پر کارگر نہیں ہوسکتا۔''(2)

درج بالا اقتباسات سے یہ واضح ہے کہ مولانا آزاد کی نگاہ سے دونوں گروہوں کے ذہنی تحفظات پوشیدہ نہیں۔ یہاں پر مولانا آزاد متوازن رویہ اپناتے ہیں جو ایسے نازک مسئلے کے معاملے میں ضروری ہے۔ نئے گروہ کے پاس صرف یورپ کا رعب ہے اور قدیم تعلیم یافتہ لوگوں کے پاس صرف مذہب۔ جدت اور قدامت، پرانی تعلیم اور نئی تعلیم، مذہب یا یورپ کی جدید ذہنی آزادی، ان میں سے کس ایک چیز کو منتخب کیا جائے، یہ فیصلہ آسان نہ تھا۔ مولانا آزاد نہ مذہب کو غیر ضروری سمجھتے تھے نہ جدید تعلیم کو سماج کے بگاڑنے کا ذریعہ۔ اس لیے اپنے تجزیے میں وہ سب سے پہلے دونوں گروہوں کی حدود کا ذکر کرتے ہیں اور آخر میں ایک مختصر سی جرح کے بعد تھوڑے تحفظات کا اظہار کرتے ہوئے نئی تعلیم کی طرف داری میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ قدیم تعلیم کے پیروؤں کی مخالفت کرتے ہوئے وہ نئی تعلیم کی روح تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں اور باتوں کو صحیح طریقے سے نہ سمجھ پانے سے پیدا ہونے والی غلط فہمیوں پر اپنی رائے دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''چوں کہ نظریں کوتاہ اور معلومات محدود ہیں، اس لیے مخالف جماعت کی رایوں سے واقفیت نہیں رکھتے۔ پردے کے موئدین یورپ کی زبانوں اور حالات سے محض بے خبر ہیں، اس لیے ان کی رائے بھی اس میدان میں سبقت نہیں لے جاسکتی۔''(3)

انقلابِ فرانس نے آزادی اور مساوات کی جس بنیاد پر ایک نئی دنیا کا تصور پیش کیا، اس کا ایک لازمی نتیجہ یہ بھی تھا کہ زندگی کے جس شعبے میں بھی غلامی اور غیر برابری کے اجزا تھے، انھیں ہدفِ ملامت بنانے کی مہم تیز ہوئی۔ مولانا آزاد اپنی گفتگو میں آزادی کے اس سوال پر عورت اور مرد کو الگ الگ اکائی سمجھے جانے پر نالاں ہیں اور بہت درست سوال اٹھاتے ہیں کہ جنس کی بنیاد اس تقسیم کا مقصد کیا ہے؟

''انسان فطرتاً آزاد ہے اور اس فطری آزادی میں کوئی خصوصیت ثابت نہیں ہوتی۔ پھر وہ کون سا معیار ہے جس کی بنا پر انسانوں کا ایک گروہ تو اس آزادی سے فائدہ اٹھائے اور دوسرا گروہ محروم دکھائی دے''۔(4)

مولانا آزاد انسان کی فطرت میں آزادی کی چاہت کو تسلیم کرتے ہیں اور آزادی سے مساوات کے رشتے کو جوڑ کر یہ سوال قائم کرتے ہیں کہ عورت اور مرد کے متعلق سماج کا نقطۂ نظر الگ الگ کیوں ہو؟ سماج کیوں نہیں یہ بات سمجھ پاتا کہ انسانی زندگی کا ایک گوشہ اگر تاریک ہے تو زندگی مکمل طور پر منور نہیں ہو سکتی۔ روشنی اور ترقی کے لیے ایک سرے سے دوسرے سرے تک روشن ہونے چاہئیں۔ وہ تلخی کے ساتھ کہتے ہیں کہ لوگوں نے یہ کیسا معیار بنادیا کہ جس کی رو سے مرد اور عورت الگ الگ ترازو میں تُلنے لگے اور ایک کو محروم رکھ کر دوسرے کی بلندی کے خواب دیکھے جارہے ہیں۔

''جب انسانی قویٰ کی عقلی نشوونما تمدنی وشائستہ زندگی کے لیے ضروری ہے تو پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ عورتیں اس عقلی نشوونما سے محروم رکھی جائیں؟ اوّل تو انھیں تعلیم دی ہی نہیں جاتی اور اگر کسی کا نرم دل اس کے مظلومانہ حال پر متاسف ہوتا بھی ہے تو صرف معمولی تعلیم ان کے لیے کافی خیال کی جاتی ہے۔ کیا وہ انسان نہیں ہیں؟ کیا ان میں دماغی قوتیں موجود نہیں ہیں؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو کیا یہ صریح ظلم نہیں ہے کہ علمی دنیا کے شائستہ مشاغل سے انھیں یک لخت محروم کردیا جائے؟''(5)

مولانا ابوالکلام آزاد عورتوں کے دفاع میں سب سے پہلے سائنسی تاویلات پیش کرتے ہیں۔ عورت اور مرد کی خداداد صلاحیتوں میں کوئی فرق نہیں۔ اگر آسمان سے تارے توڑلانا مرد کی دسترس میں ہے تو عورتیں بھی یہ کام بہ سہولت کرسکتی ہیں۔ وہ یورپ کی نئی تعلیمی روشنی کا سہارا لیتے ہوئے عورتوں او رمردوں کے عدم مساوات کے سماجی فلسفے کو ان لفظوں میں للکارتے ہیں:

''اس وقت تک عورتیں علمی لذت سے محض ناآشنا ہیں اور یہ تمام تمدنی

میدان کُل کا کُل مردوں کے قبضے میں رہا۔ اس لیے یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ ان میں مردوں کی طرح دماغی ترقی کی صلاحیت نہیں ہے کیوں کہ اس وقت تک انھیں ترقی کا موقع ہی کب دیا گیا؟ یورپ نے آج علمِ تشریح اور فزیالوجی کی تحقیقات سے یہ ثابت کردیا ہے کہ مرد اور عورت دماغی قوتوں میں بالکل برابر ہیں۔''(6)

ہندوستان کے مخصوص ماحول کو نظر میں رکھتے ہوئے مولانا کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ بعض بنیادی سوالوں کے جواب دیں۔ پورے مشرق میں عورتوں کو برابری کا درجہ دینے میں جو بنیادی رکاوٹیں ہیں، اُن پر مولانا آزاد کی نظر تھی اور یہ کس طرح کے بناوٹی قصوں یا غیرضروری الزامات کو بنیاد بنا کر گڑھے گئے فقتے ہیں، اس پر مولانا واضح طور پر روشنی ڈالتے ہیں۔ مولانا آزاد اس معاملے میں مشرق اور مغرب کا موازنہ کرتے ہیں اور مذہبی لوگوں پر یہ واضح کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ عورتوں کے تعلق سے مغرب کا رویہ مشرق کے مقابلے میں زیادہ ہمدردانہ ہے۔ ان کے مضمون کے یہ جملے بطورِ خاص ملاحظہ ہوں:

''مشرق میں جو ظالمانہ رائے عورتوں کے متعلق زمانۂ جہالت میں قائم کی گئی تھی، وہ اس وقت تک اس پر قائم ہے۔ مسلمان عام طور پر عورتوں کو ناقصات العقل والدّین اور فتنہ و فساد کی جڑ سمجھتے ہیں۔ برخلاف اس کے یورپ عورتوں کی غیر معمولی عزّت اور احترام کرتا ہے اور مردوں سے کسی امر میں کم نہیں سمجھتا۔''(7)

پندرہ سال کی عمر میں مولانا آزاد نے اپنا پہلا اخبار ''لسان الصدق'' شائع کیا۔ 1903 تک وہ اپنے خیالات ملک کے کئی اخبارات و رسائل میں پیش کر چکے تھے۔ ''لسان الصدق'' کے شمارۂ اوّل اور علی گڑھ میگزین کے نومبر 1903 کے شمارے میں شائع شدہ مولانا آزاد کے مضامین سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ اُن کے افکار و خیالات دورِ اوّل میں کس طرح کے تھے، نیز اُن کے شاندار مستقبل کے ابتدائی نقوش کیا تھے؟ ''لسان الصدق'' کے پہلے شمارے میں انھوں نے ''سوشل رفارم'' کے عنوان سے جو پہلا مضمون لکھا، اس سے ایک طرح سے مولانا کے آئندہ افکار کی پیش بندی ہو جاتی ہے۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے میل جول اور اشتراک کی جہاں وہ پُر زور وکالت کرتے ہیں، وہیں ہندوستانی سماج کے رسم و رواج اور توہمات سے بے وجہ بندھے ہونے پر انھوں نے سخت تنقید کی ہے۔ ان احوال سے مولانا یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ:

''تعلیم کو مسلمانوں میں آج تک جو ناکامیابی ہوئی، وہ بہت کچھ رسم و رواج کی پابندی سے ہوئی۔''(8)

یہ وہ دور تھا جب مسلمان عورتوں کی تعلیم کے مسئلے پر ملک میں خاصی گرم بحثیں چل رہی تھیں۔ سرسید بار بار مسلمان عورتوں کو جدید تعلیمی نظام سے دور رکھنے کی تاویلیں پیش کر رہے تھے لیکن مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں آوازیں اُٹھ رہی تھیں کہ عورتوں کی تعلیم امرِ لازم ہے۔ خواجہ غلام الثقلین اور شیخ عبداللہ لگاتار کانفرنس کے جلسوں میں عورتوں کی تعلیم کے سوال کو اپنی تجاویز کے ذریعے سامنے لا رہے تھے۔ ''لسان الصدق'' کے جس مضمون کا ابھی ذکر ہوا، اُس کے اختتام پر مولانا آزاد، خواجہ غلام الثقلین کے نظریے کی تعریف کرتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا آزاد عورتوں کی تعلیم کے بارے میں ہمیشہ مستعد رہنے والے لوگوں کے خیالات سے نہ صرف باخبر تھے بلکہ ان کی وکالت ابتدا سے ہی کر رہے تھے۔

علی گڑھ میگزین کے نومبر 1903 کے شمارے میں مولانا آزاد کا مضمون ''تعلیم نسواں'' شائع ہوا۔ یہ خصوصی شمارہ تھا جس کا عنوان تھا ''ہم اور ہماری خاتونیں۔'' 1903 میں مولانا آزاد عورتوں کی تعلیم کے بارے میں کس حوصلہ مندی کے ساتھ غور و فکر کر رہے ہیں اور مستقبل کے راستوں کی نشاندہی میں اس موضوع کو سنگِ میل مان رہے ہیں، اس کا اندازہ اس اقتباس کی روشنی میں کیا جا سکتا ہے:

''آج کل قوم کو اس ضروری مسئلے کی طرف زیادہ توجہ ہوگئی ہے اور اصولِ مسلمہ کی طرح مسٹر امیر علی کے ہم زبان ہو کر یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ قوم کا سنورنا بگڑنا تعلیم نسواں کے ہونے نہ ہونے پر موقوف ہے۔ بیشک یہ توجہ ہمارے مستقبل کی ترقیوں کی بنیاد ہے اور ثابت کرتی ہے کہ قوم کو اب اپنی ضرورتوں کا احساس ہوگیا ہے۔''(9)

مولانا کے یہ تاثرات آخر تک قائم رہے۔ عورتوں کو کیسی تعلیم دی جائے اور اُس کے انتظامات کی صورت کیا ہو، اس پر بھی مولانا آزاد نے اپنے تاثرات رقم کیے ہیں۔ مولانا اسی مضمون میں رقمطراز ہیں:

''تعلیم نسواں سے متعلق اس وقت تک جتنی رائیں شائع ہوئی ہیں، ان کا ماحصل یہ ہے کہ پرائیوٹ مکاتب جاری کیے جائیں یا ہر خاندان کے لیے علاحدہ علاحدہ مکتب بنا دیے جائیں۔ ہم پوچھتے ہیں کہ اس قسم کی تعلیم سے عورتوں کو کون سا فائدہ حاصل ہوگا؟ اس تعلیم سے جس قدر لیاقت عورتوں کو حاصل ہوگی اس سے بدرجہا اچھی لیاقت قدیم خاندانوں کی خواتین میں موجود ہے۔ خود ہمارے خاندان میں ہر لڑکی کے لیے اردو فارسی اور دینیات کا پڑھنا لازمی ہے لیکن نہ اس سے وہ فائدہ حاصل ہوتا ہے جس کی ہمیں تمنا ہے، نہ ان کے دماغ روشن ہوتے ہیں، نہ ان کی اولاد پر اچھا اثر پڑتا ہے، نہ وہ اس کے دست و بازو ہو سکتی ہیں......''(10)

روایتی سماج پر جب بھی گفتگو ہوتی ہے اور عورتوں کے مسائل زیرِ بحث آتے ہیں، پردے کا سوال ضرور اٹھتا ہے۔ عورتوں کو پردے میں رکھنے کا رواج

دنیا کے ہر سماج میں رہا ہے۔ جدید عہد میں یہ ایک عام غلط فہمی ہے کہ پردہ صرف مذہب اسلام سے متعلق ہے اور اس کا ایک لازمی نتیجہ یہ بھی مانا جاتا ہے کہ مسلمان عورتوں کی ترقی اور ہم عصر دنیا کی برکتیں حاصل کرنے میں پچھڑ جانے کا اصل سبب یہی پردہ ہے۔ سماج کے اس عمومی تاثر کو مولانا آزاد بخوبی جانتے تھے۔ مولانا کا سخت لہجہ ذیل کے اقتباس میں ملاحظہ کریں:

''ہم صاف صاف کہہ دیتے ہیں اور اسے فیصلہ قطعی سمجھ لو، اصول مسلمہ کی طرح مان لو کہ جب تک متعارف پردہ ہندستان سے نہ اٹھے گا، جب تک عورتوں کو جائز آزادی اور وہ آزادی جس کا اسلام مجوز ہے، نہ دی جائے گی، غلامی میں رکھ کر اور پردے کی تقلید کے ساتھ تعلیم دینی نہ صرف فضول بلکہ مضر اور اشد مضر ہے۔''(11)

پردہ کے بارے میں مذہبی حلقے کے سوالات مولانا سب سے پہلے نگاہ میں رکھتے ہیں۔ محرم اور نامحرم کی بحث، پردہ کرنے والی مسلمان عورت عام سماجی زندگی میں کس حد تک آگے بڑھے، پردے کے بارے میں اصل مذہبی صورت کیا ہے، مولانا آزاد نے ان امور کو اپنی گفتگو کا حصہ بنایا ہے۔ صالحہ عابد حسین نے مولانا آزاد کے ساتھ اپنی نجی گفتگو کا ذکر کرتے ہوئے پردے کی مذہبی تشریح کے بارے میں مولانا آزاد کے خیالات کا ذکر کیا ہے۔ ہم ذیل میں محترمہ کے مضمون سے متعلقہ حصہ یہاں پیش کرتے ہیں:

''اس سلسلے میں سب سے زیادہ جس مسئلے میں اختلاف ہے، وہ پردے یا حجاب کا ہے۔ بیشتر مذہبی عالم اس طرف گئے ہیں کہ عورت کو سارا جسم، جس میں چہرہ اور ہاتھ سب شامل ہیں، ڈھکنے کا، یا الفاظ دیگر برقعہ اور نقاب کا حکم ہے۔ اس کے بارے میں ایک بار میں نے مولانا آزاد سے پوچھا کہ قرآن شریف میں پردے کے سلسلے میں کیا حکم ہے۔ آیا ہاتھ اور منہ پردے میں شامل ہیں یا نہیں؟ اس پر مولانا نے فرمایا:

قرآن میں جس پردے کا حکم دیا گیا ہے، اس میں کہنیوں تک ہاتھ اور چہرہ پردے میں داخل نہیں ہے۔

دوبار مولانا نے اس جملے کی تکرار کی۔ میں نے عرض کیا:

مگر مشکل یہ ہے کہ عورتیں جب برقعہ چھوڑ دیتی ہیں تو پھر انھیں اس کا لحاظ نہیں رہتا کہ کون سا حصہ کھلا ہے اور کون سا ڈھکا ہے۔

اس پر آپ نے کہا:

'تم ٹھیک کہتی ہو، مگر یہ دوسری بات ہے۔' (12)

عورتوں کے تعلق سے مولانا آزاد کے تصورات جاننے کا ایک بہترین وسیلہ ''ترجمان القرآن'' ہے۔ خاص طور سے سورۂ النساء کی تفسیر میں مولانا کے تصورات دیکھے جاسکتے ہیں۔ ایک عام غلط فہمی رہی ہے کہ اسلام میں عورت اور مرد کے حقوق مساویانہ نہیں ہیں۔ مولانا کو بھی یہ معلوم تھا کہ یہ غلط فہمی صداقت کی طرح لوگوں کے ذہن و دل میں موجود ہے۔ اس لیے قرآن کے ترجمے اور تفسیر دونوں میں ان مسئلوں پر مولانا نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ سورۂ النساء کی 34 ویں آیت کی تفسیر میں مولانا نے اُن سوالوں کو زیر بحث لانے کی کوشش کی ہے جن پر باہم متضاد آرا ملتی ہیں۔ ''الرجال قوامون علی النساء'' کی تشریح میں مولانا آزاد تفصیل سے دنیا کے بننے اور ترقی کرنے کے واقعات بیان کرتے ہوئے عورت اور مرد کی ضرورتوں اور تاریخی وقوعات پر اس طرح متوجہ ہوئے ہیں:

''وہ کہتا ہے کہ خدا نے نوعِ انسان کو مرد اور عورت کی دو جنسوں میں تقسیم کر دیا ہے اور دونوں یکساں طور پر اپنی ہستی، اپنے اپنے فرائض اور اپنے اپنے اعمال رکھتی ہیں۔ کارخانۂ معیشت کے لیے جس طرح ایک جنس کی ضرورت تھی، ٹھیک اسی طرح دوسری جنس کی بھی ضرورت تھی۔ انسان کی معاشرتی زندگی کے لیے دو مساوی عنصر ہیں جو اسی لیے پیدا کیے گئے ہیں کہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ایک مکمل زندگی پیدا کر دیں۔ البتہ اللہ نے دنیا میں ہر گروہ کو دوسرے گروہ پر خاص خاص باتوں میں مزیت دی ہے۔ اور ایسی ہی مزیّت مردوں کو بھی عورتوں پر ہے۔ مرد عورتوں کی ضروریاتِ معیشت کے قیام کا ذریعہ ہیں، اس لیے سربراہی اور کارفرمائی کا مقام قدرتی طور پر انھیں کے لیے ہوگیا۔''(13)

مولانا کو اندیشہ ہے کہ انھیں انھی روایتی مذہبی رہنماؤں کی طرح نہ سمجھ لیا جائے جنھوں نے قرآنی تعلیمات کو ایک بندھے ٹکے چوکھٹے میں قید کرنے کی کوشش کی۔ مولانا نے کسی غلط فہمی کے پھیلنے سے پہلے یہ بات واضح کی:

''عورتیں اس خیال سے دلگیر نہ ہوں کہ وہ مرد نہ ہوئیں اور مردوں کے کام اُن کے حصے میں نہ آئے، وہ یقین کریں ان کے لیے بھی علم و فضیلت کی ساری راہیں کھلی ہوئی ہیں۔''(14)

مولانا آزاد عورت اور مرد کے حقوق کے مساویانہ روپ کو سورۂ بقر میں بھی واضح کرتے ہیں۔ آیت نمبر 228 کی تفسیر کا یہ رخ حقوق اور ذمے داریوں کا توازن پیش کرتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''لیکن قرآن نے صرف عورتوں کے حقوق کا اعتقاد ہی پیدا نہیں کیا بلکہ صاف صاف اعلان کر دیا کہ حقوق کے اعتبار سے دونوں کا درجہ ایک ہے، جس طرح مرد کے حقوق عورت پر ہوئے، ٹھیک اسی طرح عورت کے حقوق مرد پر ہوئے۔''(15)

مولانا آزاد سورۂ بقر کے چار لفظوں کو پیش کرکے مساوات کی ساری صورتیں واضح کر دیتے ہیں ''ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف'' کی تفسیر کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ ''اور حسنِ سلوک میں بیویوں کے حقوق بھی

اسی طرح شوہروں پر ہوئے جس طرح شوہروں کے بیویوں پر ہوئے۔'' مولانا صاف لفظوں میں مساوات اور خواتین کی عزتِ نفس کے امور یہاں درج کرتے ہیں:

'' قرآن نے یہ چار لفظ کہہ کر کہ لھن مثل الذی علیھن انسان کی معاشرتی زندگی کے سب سے بڑے انقلاب کا اعلان کر دیا تھا۔ ان چار لفظوں نے عورت کو وہ سب کچھ دے دیا جو اس کا حق تھا مگر جو اسے کبھی نہیں ملا تھا۔ ان لفظوں نے اسے محرومی اور شقاوت کی خاک سے اٹھایا اور عزت و مساوات کے تخت پر بٹھایا۔ پھر اس اسلوب بیان کی جامعیت اور بالغیت پر غور کرو۔ زندگی و معاشرت کی کون سی بات ہے جو ان چار لفظوں میں نہیں آگئی اور کون سا رخنہ ہے جو بند نہیں کر دیا گیا۔''(16)

مولانا آزاد یہ وضاحت بھی کرتے ہیں کہ مذہب اسلام کے وہ کون سے اصول ہیں جن پر غیر ضروری مباحث روا رکھے گئے ہیں۔'' ولھن مثل الذی علیھن با لمعروف '' (البتہ عورتوں کے مقابلے میں مردوں کو ایک خاص درجہ حاصل ہے)۔ سورۃ النساء کی اس آیت میں کسی امتیاز کی بات نہیں۔ مولانا کے الفاظ ہیں :

'' یہ ظاہر ہے کہ اس امتیاز سے مرد کو کوئی پیدائشی امتیاز حاصل نہیں ہو جاتا۔ محض خاندانی نظام کا ایک ڈھنگ ہے جس نے یہ جگہ اسے دلائی ہے۔ فرض کرو متمدن انسانوں کا خاندانی نظام اس طرح چلنے لگتا کہ انتظام معیشت کی باگ ڈور مرد کی جگہ عورت کے ہاتھ میں آجاتی تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں یہ امتیاز مرد کو نہیں ملتا، عورت کے حصے میں آتا۔''(17)

مولانا آزاد عورت اور مرد کی برابری کے معیشی معاملوں پر بھی توجہ دیتے ہیں۔ سورۃ النساء کی تفسیر میں یہ امر بھی پوری روشن خیالی کے ساتھ موجود ہے:

'' جہاں تک معیشی اور مالیاتی استقلال کا تعلق ہے، قرآن نے اس سے صاف انکار کر دیا ہے کہ یہ استقلال صرف مردوں ہی کے حصے میں آیا، اس نے قطعی لفظوں میں اعلان کر دیا کہ مرد کی کمائی مرد کے لیے ہوگی، عورت کی کمائی عورت کے لیے۔ عورت بیٹی ہو کر باپ سے الگ، بہن ہو کر بھائی سے الگ، بیوی ہو کر شوہر سے الگ مستقلاً اپنی کمائی کا انتظام کر سکتی ہے اور اس کی مالک ہو سکتی ہے۔''(18)

عورت ایک آزاد اور خود مختار کائناتی اکائی ہے۔ اس کے ساتھ اگر انصاف نہیں ہوا تو یہ پدری نظام کی زیادتی تھی۔ مولانا آزاد بہت سخت لفظوں میں اس کی مذمت کرتے ہیں۔ سورۂ یوسف پر گفتگو کرتے ہوئے مولانا آزاد نے واضح لفظوں میں عورت مرد کی برابری کا تصور پیش کیا ہے:

'' بلاشبہ مردوں نے اپنی ظالمانہ خود غرضیوں سے عورت کے بارے میں ہمیشہ ایسے ہی فیصلے کیے ہیں لیکن قرآن کا یہ فیصلہ نہیں ہے۔ اس نے ہر جگہ مرد اور عورت دونوں کا مساویانہ حیثیت سے ذکر کیا ہے، وہ فضائل و خصائل کے لحاظ سے دونوں میں کسی طرح کی بھی تفریق نہیں کرتا۔ سورۃ النساء میں جہاں ازدواجی زندگی کے احکام کی تشریح ہے، وہاں صاف صاف تصریح کر دی گئی ہے کہ فضائل و محاسن کے لحاظ سے دونوں یکساں طور پر اپنی راہیں رکھتے ہیں اور دونوں کے لیے ایک ہی طرح پر فضیلتوں کا دروازہ کھول دیا گیا ہے۔''(19)

مذہب اسلام نے عورت اور مرد میں کچھ فرق نہیں کیا ہے اور دونوں کے حقوق اور ذمہ داریوں، فضیلت اور مقام میں مکمل طور پر ایک انصاف پسندانہ رُخ قرآن میں موجود ہے۔ مولانا آزاد ترجمان القرآن کے صفحات میں ان سوالوں کو بار بار واضح کرتے ہیں۔ گذشتہ صفحات میں قرآن کے حوالے سے مولانا کے نقطۂ نظر کی خاصی وضاحت ہو چکی ہے، اب آخری اقتباس ملاحظہ کریں جس میں عورت اور مرد کی برابری کے موضوع پر مولانا کے خیالات کا نچوڑ آگیا ہے:

'' جس طرح مسلم و مومن ہیں اسی طرح مسلمہ اور مومنہ ہیں۔ جس طرح مردوں میں قانت مرد ہیں اسی طرح عورتوں میں بھی قانتہ عورتیں ہیں۔ جس طرح مردوں میں صادق مرد ہیں اسی طرح عورتوں میں بھی صادقہ عورتیں ہیں۔ جس طرح مردوں میں اللہ کا خوف رکھنے والے اور بکثرت ذکر کرنے والے ہیں اسی طرح عورتوں میں بھی اللہ کا خوف رکھنے والیاں اور بکثرت ذکر کرنے والیاں ہیں اور پھر جس طرح مردوں میں ایسے پاکباز ہیں کہ نفسیاتی خواہشوں کے غلبہ سے اپنی حفاظت کرتے ہیں اسی طرح عورتوں میں بھی ایسی پاکباز ہستیاں ہیں جو اپنی حفاظت سے کبھی غافل نہیں ہوتیں۔ غور کرو کسی وصف میں بھی تفریق نہیں۔ کسی فضیلت میں بھی امتیاز نہیں..... کسی برائی میں بھی عدم مساوات نہیں......''(20)

مولانا آزاد ہندوستان کے پہلے وزیرِ تعلیم تھے یہ غور طلب ہے کہ مولانا نے اس منصب کا استعمال بھی کمزور طبقوں کی بہبود اور خواتین کو بڑھاوا دینے میں کیا۔ آج اگر ملک کی آدھی سے زیادہ عورتیں تعلیم یافتہ ہو چکی ہیں، ہزاروں کی تعداد میں اعلا عہدوں تک پہنچ کر بہترین خدمات انجام دے رہی ہیں تو اس کے پیچھے کہیں نہ کہیں مولانا ابوالکلام آزاد کے اس ترقی پسندانہ اقدامات کا ہاتھ ہے انھوں نے عورتوں کو جدید دنیا کی باگ ڈور دینے سے دوسرے لوگوں کی طرح گریز نہیں کیا اور سیاسی، سماجی اور مذہبی تمام جہات سے عورتوں کی برابری کا اعلان کیا۔ آج جیسے جیسے عورتیں اپنی سماجی لڑائی میں آگے بڑھتی جا رہی ہیں، ایسے میں مولانا آزاد کی دانش ورانہ قیادت کی جلوہ سامانیاں ہماری آنکھیں خیرہ کر دیتی ہیں۔

مآخذ

1. مسلمان عورت، مترجم مولانا ابوالکلام آزاد، مقدمہ صفحہ۔ 9
2. ایضاً، صفحہ۔ 9
3. ایضاً، صفحہ۔ 10
4. ایضاً، صفحہ۔ 11
5. ایضاً، صفحہ۔ 11
6. ایضاً، صفحہ۔ 12
7. ایضاً، صفحہ۔ 13
8. امام الہند جلد چہارم مرتبہ سیدہ سیدین حمید، ناشر۔ انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز، نئی دہلی، 1990، 29
9. علی گڑھ منتھلی نومبر 1903، (بہ حوالہ فکر و نظر، ابوالکلام آزاد نمبر 1989 تعلیم نسواں کی ابتدائی کوششیں اور مولانا ابوالکلام آزاد۔ پروفیسر ثریا حسین، صفحہ۔ 173)
10. ایضاً، صفحہ۔ 173
11. ایضاً، صفحہ۔ 173
12. ابوالکلام آزاد کی نظر میں عورت کا مقام، قرآن پاک کی روشنی میں۔ صفحہ 75-74، (بزم دانشوراں: صالحہ عابد حسین)
13. ترجمان القرآن، جلد اوّل، صفحہ 368
14. ترجمان القرآن، جلد اوّل، صفحہ 368
15. سورۂ بقر کی 2-228 آیت کی تفسیر، از۔ مولانا آزاد (ترجمان القرآن جلد دوم)
16. ابوالکلام آزاد کی نظر میں عورت کا مقام، قرآن پاک کی روشنی میں۔ صفحہ -74، (بزم دانشوراں: صالحہ عابد حسین)
17. ایضاً، صفحہ۔ 77
18. ترجمان القرآن، جلد اوّل، صفحہ 309
19. ترجمان القرآن، جلد اوّل
20. ایضاً

❑❑❑

پتہ:

C/o Ravindra Kumar (Artist)
Vill-Aunta, P.O. Mokamaghat
Dist, Patna-803303 (Bihar)

❑❑❑

منتخب التواریخ (جلد اوّل، دوم و سوم)

مؤلف: ملا عبدالقادر بدایونی / مترجم: ڈاکٹر علیم اشرف خاں

عبدالقادر بن ملوک شاہ بدایونی نہ صرف با کمال شاعر تھے بلکہ تاریخ نویسی میں بھی انھیں ملکہ حاصل تھا۔ معروف مورّخ ابوالفضل کے ہمعصر ہونے کے ساتھ ساتھ انھیں بھی اکبری دربار میں رسائی حاصل تھی۔ انھیں ترجمہ اور تالیف پر مامور کیا گیا تھا۔ اسی دوران انھوں نے تاریخ الفی، رزم نامہ، جامع رشیدی اور بحرالاسمار جیسی کتابیں لکھیں۔ اکبری عہد کی ساٹھ سالہ تاریخ سے آگاہی کے لیے ابوالفضل کے ''اکبر نامہ'' کے ساتھ ساتھ ملاّ عبدالقادر کی ''منتخب التواریخ'' (تین جلدوں میں) کا مطالعہ بھی ناگزیر ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ملاّ عبدالقادر نے یہ تاریخ شاہی محل میں بیٹھ کر نہیں لکھی جو بادشاہ اکبر کی پسند و ناپسند سے گزرتی بلکہ آزادانہ تحریر کی اور یہی آزادانہ رائے اس کتاب کو ''اکبر نامہ'' سے منفرد کرتی ہے۔

صفحات: جلد اوّل 409 / جلد دوم و سوم 620، قیمت: جلد اوّل -/335 روپے / جلد دوم و سوم 555 روپے

جتنے پاس اتنے دور

مصنف: دھیریندر سنگھ جفا

''جتنے پاس اتنے دور'' انڈین فائٹر پائلٹ کی آپ بیتی ہے جو ناول کے اسلوب میں لکھی گئی ہے۔ یہ کتاب دھیریندر سنگھ جفا نے پہلے انگریزی میں لکھی بعد میں ڈی. گھانے اسے بنگلہ میں ترجمہ کیا، پھر ہندی ترجمہ خود مصنف نے اپنے دوست سید مزمل فدا کے تعاون سے کیا اور اب اردو ترجمہ جناب شاہد جمال نے کیا ہے جسے قومی اردو کونسل نے حال ہی میں شائع کیا ہے۔ اس آپ بیتی میں 1970 سے 1972 تک ہندوستان اور پاکستان کی جنگوں کے توسط سے تقسیم شدہ ہندوستان کے ٹوٹے بکھرے دلوں کی آہوں اور کراہوں کو بڑی صفائی اور صدق دلی سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ کتاب اپنے ملک کی حفاظت اور انسانی رواداری کے باب میں ہمارے جذبے اور احساس پر گہرے اثرات مرتسم کرتی ہے۔

صفحات: 270، قیمت -/145 روپے

سیدہ جعفر

محبت کا مغنّی احمد فراز

احمد فراز اپنے اکثر ہم عصروں ناصر کاظمی، ابن انشا، منیر نیازی، جمیل الدین عالی، افتخار جالب اور جون ایلیا کی نغمہ سرائی میں اپنے نرم اور پرسوز لہجے اور اپنے اشعار کی ترنم ریزی و نغمگی سے پہچانے جاتے ہیں۔ فیض کے انتقال کے بعد احمد فراز پاکستان کے سب سے مقبول شاعر تھے اور اس مقبولیت کا سبب ان کے اشعار کی سادگی و پرکاری، پیکروں کی رعنائی، علامتوں کی معنویت اور وہ حسیت بھی تھی جس کا زندگی کی سچائیوں سے براہ راست تعلق تھا۔ اس دور تک پہنچتے پہنچتے اردو غزل میں ماورائیت کی جگہ انسانی زندگی کے ٹھوس حقائق اور روزمرّہ کے جانگداز تجربات نے لے لی تھی۔ انسان ہر روز زندگی کا ایک نیا زہر پیتا اور اپنی بقا کے لیے اسے امرت میں بدلنے کی جدوجہد کرتا رہتا ہے زندگی کے ایسے گوناگوں تجربات سے احمد فراز کی حسیت کا رشتہ بہت مضبوط و مستحکم تھا۔ احمد فراز نے خیال آفرینی کی اونچی اڑانیں بھرنے کی کوشش نہیں کی، فلسفہ طرازی سے مرعوب نہیں کیا، فراز نے انسانی تجربے کی کسک کو بڑی شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے اور محبت کو جو ان کی دانست میں زندگی بھی ہے اور حاصل زندگی بھی، ارضی تناظر میں دیکھا اور محسوس کیا ہے:

تو خدا ہے نہ میرا عشق فرشتوں جیسا
دونوں انساں ہیں تو کیوں اتنے حجابوں میں ملیں

احمد فراز بنیادی طور پر غزل گو اور دردِ عشق کے شاعر ہیں۔ انھوں نے گوناگوں تجربات محبت کی بڑی طرحداری اور دلکشی کے ساتھ تصویر کشی کی ہے۔ فراز کی غزلیہ شاعری میں جو اثر آفرینی اور جاذبیت ہے، اس کی مثالیں ان کے ہم عصروں میں کم نظر آتی ہیں۔ احمد فراز کا عشق، ہجر مسلسل اور دائمی فراق کا عشق نہیں۔ مل کے بچھڑ جانے کے دلخراش اور کرب آفرین تجربے کا درد ہے۔ ان کے کلام میں ایسے اشعار ہماری نظر سے گزرتے ہیں:

ہوا ہے تجھ سے بچھڑنے کے بعد یہ معلوم
کہ تو نہیں تھا ترے ساتھ ایک دنیا تھی
جاؤ کہ مجھے یقیں نہیں ہے
تم اب کے گئے تو آسکو گے
اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں
رنجش ہی سہی دل ہی دکھانے کے لیے آ
آ پھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کے لیے آ
وہ جس گھمنڈ سے بچھڑا گلہ تو اس کا ہے
کہ ساری بات محبت میں رکھ رکھاؤ کی ہے

فراز کی مضمون آفرینی، تازہ خیالی اور دلنشیں استعارہ سازی نے ان کے تغزل کو نکھار دیا ہے۔ احمد فراز نے فارسی اور اردو کے اکابر غزل سے طرز دلربائی سیکھی تھی اور دلوں پر حکومت کرنے کا راز جاننے کی کوشش کی تھی۔ وہ کہتے ہیں:

میں نے بھی کیا قصد غزل کا کہ سفر میں
غالب سا طرحدار ہے رہبر میرے آگے
میر و انیس و غالب و اقبال سے الگ
راشد، ندیم، فیض سے رغبت کے رات دن
فردوسی و نظیری و حافظ کے ساتھ ساتھ
بیدل، غنی، کلیم سے بیعت کے رات دن

کلاسیکی شعرا کے ساتھ یہاں احمد فراز نے راشد، ندیم اور فیض کا بھی ذکر کیا ہے جو ان کے پسندیدہ تخلیق کار تھے۔ احمد فراز نے ان شعرا کی نشان دہی کر کے اپنی شعریات کے مزاج کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ ایسے بہت سے شعر کلام فراز میں تلاش کیے جا سکتے ہیں جن میں انھوں نے قدیم متغزلین کے طرز ادا اور انداز نظر سے اپنے تغزل میں بانکپن کا اضافہ کیا ہے۔ فراز کا کلام ماضی کی کلاسیکی شاعری اور حال کے تقاضوں کے درمیان ایک جاذب نظر کڑی معلوم ہوتا ہے۔ فنی روایات کی پاسداری کے ساتھ ساتھ احمد فراز نے غزل کے روایتی آہنگ اور اس کے لب و لہجے کی کورانہ نقالی سے گریز کیا اور نئے لب و لہجے، نئی علامتوں، نئی امیجری اور ابلاغ کے جدید وسیلوں سے کام لیا ہے۔ احمد فراز نے روایت کو اپناتے ہوئے اس فرسودگی سے گریز کیا جو نئے رجحانات کی پذیرائی اور نئی علامتوں کی معنویت سے بیگانہ تھی:

اب مرے واسطے تریاق ہے الحاد کا زہر
تم کسی اور پجاری کے خدا ہو جانا
اس کا کیا ہے تم نہ سہی تو چاہنے والے اور بہت
ترکِ محبت کرنے والو تم تنہا رہ جاؤ گے
تمام عمر کہاں کوئی ساتھ دیتا ہے
یہ جانتا ہوں مگر تھوڑی دور ساتھ رہو

کلام فراز کے تیرہ مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ موضوعی تجربات اور معروضی

مشاہدات کو گویائی عطا کرنے میں فراز کا رچا ہوا شعری ذوق، ان کا جمالیاتی شعور، فنی آگہی اور ادبی بصیرت بہت کام آئی۔ یہ جمالیات کی ایک اہم بحث رہی ہے کہ حسن کسی شے میں بذات خود موجود ہوتا ہے یا دیکھنے والے کا حسنِ نظر اسے تابناکی عطا کرتا ہے۔ اس تصور کے نقوش سودا، جگر اور بعض دوسرے شعرا کے علاوہ فیض اور احمد فراز کے اشعار میں اپنی جھلک دکھاتے رہتے ہیں کہ دیکھنے والے کی نظر حسن کی تخلیق کا باعث ہوتی ہے سودا کہتے ہیں:

سودا جو تیرا حال ہے ایسا تو نہیں وہ
کیا جانیے تو نے اسے کس آن میں دیکھا

جگر نے بھی اسی خیال کا اظہار کیا ہے

اس طرف بھی نظر اے دیدۂ صاحب نگراں
میں نے ذرّوں سے تراشے ہیں ستاروں کے جہاں
ہاں دعا دے میری اس خوش نظری کو اے دوست
اس سے پہلے تیرے جلوؤں کا یہ عالم تھا کہاں

فیض نے تصورِ حسن کے بارے میں کہا تھا

ہے وہی عارضِ لیلیٰ وہی شیریں کا دہن
نگہِ شوق گھڑی بھر کو جہاں ٹھہری ہے

احمد فراز کہتے ہیں:

اپسرا تھی نہ حور تھی نہ پری
دلبری میں مگر زیادہ تھی

فنکار کی تخلیقی حسیت کا اس کے جمالیاتی شعور سے گہرا تعلق ہوتا ہے اکثر شعرائے اردو نے اس جمالیاتی نظریے کی تائید کی ہے کہ حسن دیکھنے والے کی نظر کا کرشمہ ہے۔ کلاسیکی شاعری میں محبوب ''جمال دل فروز'' کا پیکر سمجھا جاتا تھا۔ جدید شاعری میں محبوب کا تصور ایک بدلی ہوئی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے:

کوئی یوں ہی سا تھا جس نے مجھے برباد کیا
نہ کوئی چاند کا ٹکڑا نہ کوئی زہرہ جبیں

احمد فراز کا یہ بیان کہ ''اپسرا تھی نہ حور تھی نہ پری'' محبوب کے اسی بدلے ہوئے تصور کا غماز ہے۔

احمد فراز کی غزلیں ان کی نظموں سے زیادہ ان کی ہنرمندی کا احساس دلاتی ہیں دو مصرعوں میں جامع اور پہلودار ابلاغ کے وسیلے سے قاری کے دل پر اپنے تاثر کا نقش ثبت کر دینے کا ہنر احمد فراز کی پہچان بن گیا ہے۔ اس سلسلے میں کلاسیکی غزل کے قیمتی ورثے سے آگہی اور تعلق خاطر نے بھی انھیں روشنی دکھائی ہے اور نئی جمالیاتی جہتوں کو ابھارا ہے۔ کلاسیکی شعرا سے اثر پذیری احمد فراز کے اشعار میں اپنی جھلک دکھاتی رہتی ہے۔ ان کا ایک شعر ہے:

فراز شہرِ غزل میں قدم سبک سے رکھ
کہ اس میں میر سا غالب سا خوش نوا بھی ہے

یہ شعر سودا کی پیروی کا مظہر ہے جس میں وہ کہتے ہیں:

سنبھل کے رکھیو قدم دشت خار میں مجنوں
کہ اس نواح میں سودا برہنہ پا بھی ہے

اسی طرح اور بہت سے کلام شعر فراز میں بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں جن میں قدیم متغزلین کے طرز فکر سے وہ فیض یاب نظر آتے ہیں۔ کلاسیکی شعرا کے اکتسابات سے اخذ وقبول نے احمد فراز کے اشعار میں رچاؤ، پختگی اور بانکپن کا اضافہ کیا ہے۔ فراز کی شاعری ماضی کی روایات اور حال کے تقاضوں کے درمیان ایک جاذب نظر کڑی دکھائی دیتی ہے۔

احمد فراز کے بعض نقاد انھیں فیض کا مقلد تصور کرتے ہیں۔ ہر دور کا تخلیق کار اپنے ہم عصروں سے اثر پذیر ہوتا ہے۔ احمد فراز کے بعض اشعار طرز فیض سے وابستگی کے آئینہ دار ہیں لیکن ان میں فراز کا قد فیض سے بہت چھوٹا نظر نہیں آتا۔ فراز کے تغزل کی اصل تابناکی اور دلکشی وہاں محسوس کی جاسکتی ہے جہاں ان کی انفرادیت جاگ اٹھی ہے۔ ان اشعار میں شاعر کی شخصی لے اور اس کا ذاتی آہنگ سنائی دیتا ہے۔

فراز کی شاعری پر فیض کا جو اثر ہے وہ داخلی واردات کی عکاسی اور عصری حسیت کے اظہار کی سطح پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ فیض کے انتقال پر ''بیادِ فیض'' کے عنوان سے احمد فراز نے جو اشعار کہے ہیں وہ فیض سے ان کے ذہنی قرب اور جذباتی لگاؤ کے ترجمان ہیں:

گرفتہ دل ہے بہت شام شہر یاراں آج
کہاں ہے تو کہ تیرا حال دلبرا لکھوں
کہاں گیا ہے میرے دل میرے مسافر تو
کہ میں تجھے رہِ منزل کا ماجرا لکھوں
تو مجھ کو چھوڑ گیا لکھ کے نسخہ ہائے وفا
میں کس طرح تجھے اے دوست بے وفا لکھوں

بعض نقادوں نے فراز کو فیض کا جانشین قرار دیا ہے حقیقت یہ ہے کہ فیض کی جانشینی ہم عصر شعرا میں سب سے زیادہ فراز ہی کو زیب دیتی ہے۔

فراز کے نقادوں کا ایک گروہ انھیں نوجوانوں کا شاعر سمجھتا ہے ان نقادوں نے احمد فراز کے اس کلام سے صرف نظر کیا ہے جس میں وہ ''فیضان محبت'' نہیں ''عرفان محبت'' کے ترجمان نظر آتے ہیں۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کلام فراز میں ایسی غزلیں موجود ہیں جن میں نوجوانی کی والہانہ کیفیت، جوش،

امنگ اور سرمستی کا وہ سارا سرمایہ موجود ہے جو عمر کی اس منزل کی تخصیص سمجھا جاتا ہے جب جذباتی مد وجزر اور احساس کے تموج میں ادبی شخصیت کو توازن برقرار رکھنا مشکل ہوجاتا ہے۔ یہ ہلکی پھلکی اور رومانیت سے سرشار غزلیں نوجوان نسل کو اپیل کرتی اور ان کی توجہ اسیر کر لیتی ہیں۔

احمد فراز کی کائنات فکر زیادہ وسیع نہیں۔ ان کے بعض شعر ایسے ہیں جو اپنی معنویت، ترسیلی حسن یا فنی شادابی سے زیادہ شاعر کی شہرت کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں لیکن کلام فراز میں ایسے اشعار کی تعداد کم نہیں جو دیرپا معنویت کے حامل ہیں اور قاری کے حافظے میں محفوظ ہوجاتے ہیں۔ سادگی ان کے طرز سخن کا ایک اہم وصف ہے۔ فراز کا کلام احساس کی بھٹی میں تپ کر نکھر گیا ہے، اس لیے بھی وہ سننے والے کو اپنے دل کی آواز معلوم ہوتا ہے۔

احمد فراز کی غزلیں مہدی حسن، اقبال بانو، بیگم اختر، غلام علی اور ملکہ پکھراج جیسے کانوں میں رس گھولنے والے ماہران موسیقی نے بڑے ذوق و شوق اور فنکارانہ محویت کے ساتھ گائی ہیں۔ ان کے وسیلے سے بھی احمد فراز کی شہرت پاکستان کی سرحدیں پار کر کے ہندوستان کے علاوہ ان ملکوں میں پہنچ گئی جہاں اردو غزل کے شیدائی اور رسیا بس گئے تھے لیکن گائیکی کلام فراز کی مقبولیت کا واحد سبب نہیں ہے۔

کلام فراز کے تیرہ مجموعوں میں انسانی فکر واحساس کی ترجمانی کرنے والے اتنے مختلف اور متنوع شعر ملتے ہیں کہ تجربات کی تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ فراز کی شاعری جذبے کی تڑپ اور احساس کی شدت کی وہ سخن سنجی ہے جس نے تجربے سے التہاب حاصل کیا ہے۔ لفظیات کی خوبصورت تتلیاں قاری کو دعوت نظارہ ضرور دیتی ہیں لیکن فراز کی شاعری کا اصل حسن انسانی رویوں کی عکاسی کا رہین منت ہے۔ فراز کے حسن پیکر دلوں کو چھو لیتے ہیں۔ انسان کی نارسائی اور اس کی محرومیوں کا درد فراز کے شاعرانہ وجود اور احساس کا جزو بن چکا تھا۔ ان کے کلام میں عشقیہ کیفیات و تجربات اور واردات کی ایک دنیا آباد نظر آتی ہے۔ فراز کے چند شعر ملاحظہ ہوں جو ان کے انداز ترسیل اور طرز ادا کے آئینہ دار ہیں:

کس کس کو بتائیں گے جدائی کا سبب ہم\
تو مجھ سے خفا ہے تو زمانے کے لیے آ

کچھ تو میرے پندار محبت کا بھرم رکھ\
تو بھی تو کبھی مجھ کو منانے کے لیے آ

بزم مقتل جو سجے کل تو یہ امکان بھی ہے\
ہم سے بسمل تو رہیں آپ سا قاتل نہ رہے

تمام عمر کہاں کوئی ساتھ دیتا ہے\
یہ جانتا ہوں مگر تھوڑی دور ساتھ رہو

زندگی سے بہت گلا ہے مجھے\
تو بہت دیر سے ملا ہے مجھے

احمد فراز کی شخصیت ''دل گداختہ'' اور ''چشم نم'' کی پروردہ ہے:

اپنی افسردہ مزاجی کا برا ہو کہ فراز\
واقعہ کوئی بھی ہو آنکھ کو بھر جانا ہے

احمد فراز محبت کو زندگی کا اعلیٰ ترین مقصد قرار دیتے ہیں اور ان کی شاعری میں شخصی محبت کی حدیں احترام آدمیت اور انسان دوستی سے مل جاتی ہیں۔

وہی عشق جو تھا کبھی جنوں اسے روزگار بنا دیا\
کہیں زخم بیچ کے آ گئے کہیں کوئی شعر سنا دیا

غم عشق اور عصری حسیت سے فراز کی شاعری کا خمیر اٹھا ہے

فراز کی شاعری میں غم محبت اور عصری آگہی دونوں عناصر چمک اٹھے ہیں۔ وہ ''سنت منصور وقیس'' کے شاعر ہیں اور ان دونوں کی کارفرمائی سے ان کی شاعری کا تشخص قائم ہوتا ہے:

غم دنیا میں غم یار بھی شامل کر لو\
نشہ بڑھتا ہے شرابیں جو شرابوں میں ملیں

□□□

پتہ:
9-1-24/1, Langer House,
Hyderabad-500008 (A.P.)

آندھی (منظرنامہ)

مصنف: گلزار

اردو زبان میں فلمی منظرنامہ ایک نئی صنف ادب ہے۔ اسے بصری پیکروں کا ایسا سلسلہ کہا جاسکتا ہے جو کہانی کا روپ دھارن کر لے۔ فلم ''آندھی'' کا یہ منظرنامہ کملیشور کے ناول ''کالی آندھی'' پر مبنی ہے اور اس کا اسکرین پلے، مکالمے اور گیت گلزار کے قلم سے ہیں۔ اس کتاب کا مطالعہ مجموعی دلچسپی کا باعث بھی ہوگا لیکن اس کی اشاعت کا ایک مقصد ان طلبہ اور طالبات کی رہنمائی بھی ہے جو فلمی شعبے میں اپنا مستقبل بنانے کے خواہش مند ہیں۔

صفحات: 122، قیمت -/65 روپے

سنجے کمار

چکبست کا قائم کردہ کشمیری کلب

ادبی اور سماجی نشستوں کا سلسلہ ہمارے ہاں دور قدیم سے رہا ہے۔ مشاعرے، مرثیہ خوانی کی محفلیں آزاد اور حالی کے دور کے نظم خوانی کے جلسے، انجمن ترقی اور مصنفین اور حلقۂ ارباب ذوق وغیرہ کی نشستوں کو اسی زمرے میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

1857 میں جو حالات و واقعات رونما ہوئے، ان کا اثر کشمیری برہمنوں پر بھی پڑا اور وہ بھی علمی، اخلاقی، معاشی اور معاشرتی بحران کے شکار ہوگئے۔ ان کو اس حالت سے نکالنے کے لیے کشمیری رہنماؤں نے کئی اصلاحی پروگرام چلائے۔ پنڈت بشمبھر ناتھ اپنے مضمون ''اصلاح قوم'' میں رقم طراز ہیں:

''سوشل رفارم کی بنیاد شیونرائن بہار نے 1868 کے قریب ڈالی۔ اسی غرض سے اس بہی خواہ قوم نے 1870 سے قبل ہی کشمیر کا سفر کیا اور واپس آکر فوراً ہی ''مراسلۂ کشمیر'' جاری کیا اور ایک انجمن قومی دور رفتگاں کشمیر کے نام سے قائم کی۔ اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ کشمیری اپنی گری ہوئی حالت کو سنبھال کر پسماندگان کشمیریوں کی دستگیری کریں۔ ''مراسلۂ کشمیر'' سے یہ امید تھی کہ وہ دو چار سال میں قوم کو اصلاح کے واسطے تیار کردے گا اور صغیر سن لڑکوں کے واسطے انجمن اس غرض سے قائم ہوئی تھی کہ مناسب تعلیم پاکر کم از کم دس بارہ شخص تو ایسے تیار ہوجائیں جنھیں عملی کارروائی کرنے کی جرأت ہو۔ اس انجمن کی کیفیت ایک ہفتہ وار کلب کی تھی 88-1887 میں یہ انجمن ٹوٹ گئی اور ''مراسلۂ کشمیر'' کا دور بھی ایک دو برس کے بعد ختم ہوگیا— انجمن دور رفتگان کشمیر کے ٹوٹنے کے تھوڑے ہی دن بعد ''مراسلۂ کشمیر'' میں شام کشن صاحب کول نے ایک سوشل انجمن قائم کرنے کی تحریک پیش کی۔ جلد ہی کلب قائم ہوگیا اور کلب کا نام ''کشمیری نیشنل کلب'' رکھا گیا۔ پنڈت بشن نرائن در ابر اس کے سکریٹری مقرر ہوئے۔''

اس زمانے کے حالات کا تفصیلی ذکر چکبست نے اپنی ایک نظم ''مرقع عبرت'' میں کیا ہے، نظم کے کچھ بند ملاحظہ فرمائیں:

عبرت نہیں دیتا انھیں نیرنگِ زمانہ
عمراُن کی فقط لہو و لعب کا ہے فسانہ
تعلیم کہاں اور کہاں محبتِ دانا
بس پیش نظر رہتا ہے آئینہ و شانہ
گہہ رُخ پہ گہے موئے پریشاں پہ نظر ہے
اک شغل یہی ان کے لیے شام و سحر ہے

مٹی میں یہ قدرت کے عطیے ہیں ملاتے
کچھ نشوونما جوہر ذاتی نہیں پاتے
عزت جو بزرگوں کی ہے وہ بھی ہیں گنواتے
بازاروں میں دولت ہیں جوانی کے لٹاتے
کاشانۂ تہذیب سنورتا نہیں دم بھر
وہ نشہ چڑھا ہے کہ اترتا نہیں دم بھر

مفلس ہیں مگر خبط امیروں سے سوا ہیں
اچھے یہ اسیر قفسِ حرص و ہوا ہیں
ناموس کے طالب ہیں نہ پابند حیا ہیں
سیرت سے غرض کچھ نہیں صورت پہ فدا ہیں
پروا نہیں ماتگے کا اگر جامۂ تن ہو
سودا ہے تو یہ ہے کہ نہ دامن پہ شکن ہو

خودشانِ ریاست میں ہوئے جاتے ہیں برباد
گو حجرۂ کلفت میں کڑھے مادرِ ناشاد
دیکھے نہ سنے خلق میں اس طرح کے آزاد
کیا باعثِ عبرت ہو انھیں قوم کی فریاد
جو شرم سے میلے نہ ہوں تیور ہیں یہ ان کے
دل رکھتے ہیں فولاد کا جوہر ہیں یہ ان کے

اس وقت کے حالات پنڈت برج کشن ٹوپا کی زبانی بھی سنیے ''اس وقت کشمیری پنڈت قوم کے نوجوانوں کی اخلاقی اور تعلیمی حالت اچھی نہ تھی۔ جوا کھیلنا، پتنگ اڑانا، کبوتر پالنا، کشمیری محلے کے چوراہے پر جمع ہوکر فضول اور بیہودہ باتوں میں وقت ضائع کرنا ایک عام طریقہ ہوگیا تھا۔ ہولی کے موقع پر کشمیری محلے کا چوراہا ایسا منظر پیش کرتا تھا کہ دیکھنے والے کانوں پر ہاتھ رکھیں۔ کسی شریف آدمی کا گزر اس وقت وہاں ناممکن تھا۔''

چکبست نے 1904 میں ایک کلب ''انجمن نوجوانانِ کشمیر'' کے نام سے قائم کیا۔ اس کلب میں شیونرائن بہار کے نام پر ایک لائبریری بھی قائم کی۔ نشستوں کا انتظام اسی لائبریری میں ہوا کرتا تھا۔'' سنا گیا تھا کہ اس لائبریری

میں کوئی ایسی کتاب نہیں تھی جس کا مطالعہ خود انھوں نے (چکبست نے) نہ کرلیا ہو۔'' کلب کے سبھی ممبر روزانہ شام کو جمع ہوتے تھے اور چکبست کی موجودگی میں اخبار پڑھے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ ہفتہ وار جلسہ بھی ہوتا تھا۔ جلسے میں کسی طے شدہ موضوع پر مضمون پڑھا جاتا تھا۔ مضمون پر ممبران تقریریں کرتے تاکہ انھیں تقریر کرنے اور خیالات کا اظہار کرنے کا سلیقہ آجائے۔ یہ تمام کاروائیاں چکبست کے سامنے ہوا کرتی تھیں۔ چکبست مضمون اور ممبروں کی تقریریں سنتے اور ان کی اصلاح کرنے کی کوشش کرتے۔ ہفتہ وار جلسہ کے علاوہ کلب کا سالانہ جلسہ بھی ہوا کرتا تھا۔

ڈاکٹر افضال احمد (جنھوں نے چکبست پر پروفیسر احتشام حسین کی نگرانی میں پی.ایچ.ڈی.کیا تھا) کو پنڈت برج کشن گرٹو نے کئی رجسٹر دیے تھے جن میں کلب کی رپورٹیں درج تھیں۔ ان رپورٹوں کو ہم ڈاکٹر افضال احمد کی کتاب ''چکبست حیات اور ادبی خدمات'' کے صفحہ 44 تا 75 تک من وعن نقل کر رہے ہیں جن سے کلب کے مقاصد اور اس کے حالات پر روشنی پڑتی ہے۔

کلب کے چھٹے جلسے میں جو 1910 میں ہوا کلب کے سکریٹری پنڈت ترلوکی ناتھ کول صاحب فرماتے ہیں:

'' کلب کا اصل مقصد نوجوانوں کی اصلاح ہے۔ ان کے دماغ کو علم کے فوائد سے آگاہ کرنا، ان کو بلند درجے کی تعلیم کے واسطے تیار کرنا، ان کو تمام سوشل خرابیوں سے الگ رہنے اور آپس میں میل جول اور بھائی چارہ کرنے کی ٹریننگ دینا ہے۔''(1)

کلب کے ساتویں جلسے کی سالانہ رپورٹ میں ترلوکی ناتھ صاحب فرماتے ہیں: ''اس کلب کا مقصد ایک مرکز کی حیثیت سے بچوں اور نوجوانوں کی ذہنی اور جسمانی تربیت کی خدمات انجام دینا ہے اور انھیں مضر اثرات سے محفوظ رکھنا ہے۔ ان کے چال چلن کو درست کرنا اور ان کے اندر اخلاق اور ہمدردی کو استحکام دینا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان میں ادبی صلاحیت کو بھی پیدا کرنا ہے۔ مختصر طور پر اس کی کوشش کی گئی ہے کہ نوجوانوں کو اپنی زندگی کامیاب بنانے کے لیے تیار کردیا جائے یا دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ انھیں واقعی تعلیم یافتہ اور مہذب بنادیا جائے بجائے اس کے کہ وہ صرف نام کے گریجویٹ یا انڈر گریجویٹ ہوں۔''(2)

کلب کے مقاصد بالکل صاف اور واضح تھے وہ کوئی تفریحی کلب نہ تھا بلکہ ایک اصلاحی درس گاہ تھی۔ جہاں ہر ممبر کے تصفیۂ نفس کی کوشش ہوتی تھی، چکبست اس کلب کے ''نقاد'' کہلاتے تھے۔ ان کی صحیح جگہ اور اختیارات کو سمجھنے کے لیے ہم رجسٹر سے مدد لیتے ہیں جس میں واضح طور پر نقاد کے حقوق وفرائض کا ذکر کیا گیا ہے:

'' رول نمبر 13- نقاد کلب کا عمر بھر ممبر رہے گا۔

رول نمبر 17- کسی ناگہانی کے موقع پر نقاد جنرل باڈی کے ممبران کو مطلع کرے گا اور ان سے گفتگو کرے گا۔

رول نمبر 20- ایسوسی ایشن اور اس کی شاخوں کی نگہبانی کے واسطے نقاد مقررہ ممبران میں سے ایک منیجر کا انتخاب کرے گا اور مندرجۂ ذیل کو نامزد کرے گا۔

(ا) ایک نائب سکریٹری (ب) ایک فائنشیل سکریٹری

(پ) ایک نائب لائبریرین (ت) ایک نائب فائنشیل سکریٹری

(ج) ایک لائبریری منیجر (د) ایک نائب منیجر لائبریری

رول نمبر 21- اپنی غیر حاضری کی خاطر نقاد ایک نائب بھی مقرر کرے گا۔

رول نمبر 22- نقاد کو کسی انتظامیہ کمیٹی کا سابق افسر ہونا چاہیے۔''

کلب کے نقاد کے حقوق اور فرائض کا جائزہ لینے سے چکبست کے اختیارات کا مکمل طور پر علم ہوجاتا ہے۔ صاف ظاہر ہوجاتا ہے کہ چکبست کلب کے روح رواں تھے۔

جلسوں میں عام طور پر اس طرح کے مضامین لیے جاتے جو نوجوانوں کی اصلاح کے لیے مفید ثابت ہوں۔ مثلاً:

10 مئی 1914 کے جلسے کا مضمون زیر بحث تھا ''کیرکٹر کا بننا۔''

14 جون 1914 کے جلسے کا مضمون زیر بحث تھا ''راجہ رام موہن رائے''

26 جولائی 1914 کے جلسے کا مضمون زیر بحث تھا ''کشمیریوں کا کردار''

14 مارچ 1915 کے جلسے کا مضمون زیر بحث تھا ''ہندوستانی اسکولوں میں مادری زبان میں تعلیم''

18 اپریل 1915 کے جلسے کا مضمون زیر بحث تھا ''مشترکہ خاندان''

عام طور پر ہر سال کے شروع میں گذشتہ سال کی کارگزاریوں پر بحث ہوا کرتی تھی۔ خامیوں کا جائزہ لیا جاتا اور ان کی اصلاح کی کوشش ہوتی۔ لیکن کلب کی 1914 کے بعد کی رپورٹیں دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ چکبست کلب کے کاموں سے مطمئن نہ تھے۔ 15 فروری 1914 کے جلسے میں تقریر کرتے ہوئے چکبست نے جو کچھ کہا اس کے متعلق کول صاحب کا ارشاد ہے:

'' پنڈت برج نرائن چکبست نے ہماری گذشتہ سال کی کارگزاریوں کا مختصر جائزہ لیتے ہوئے کلب کے معاملات میں برتی گئی عام لاپرواہی پر روشنی ڈالی جو گذشتہ سال سے اتفاق سے زیادہ ہوگئی تھی۔ انھوں نے یہ کہا کہ کلب کی زندگی ہماری سوسائٹی میں ایک اخلاق وعیوب کی طاقتوں کی جدوجہد بن کر رہ

گئی ہے۔ جب تک اخلاق کی فتح ہوتی رہی ہمارا کلب ترقی کی راہ پر گامزن رہا، لیکن جس ساعت سے بیہودہ، بے کار اور غیر سنجیدہ مقاصد نے اقتدار حاصل کرلیا اس وقت سے ہماری گذشتہ سالوں کی کارگزاریوں پر خاک پھر گئی اور سارے ماحول کی خوبی اور پاکبازی ختم ہوگئی۔"

دوسرے سال کی رپورٹ جو چکبست نے بہ حیثیت صدر جلسہ پیش کی اس سے ان کے دل کا مکمل طور پر ٹوٹ جانا ثابت ہوتا ہے اور اسی چیز نے ان کو مجبور کیا کہ کلب سے دست بردار ہوجائیں۔ ان کے اس عمل نے کلب کا مکمل طور پر خاتمہ کردیا۔ گرٹو صاحب لکھتے ہیں:

''صدر جلسہ نے ایک فصیح تقریر میں ایسوسی ایشن کی شروعات سے آخر تک تاریخ بیان کی۔ انھوں نے کہا کہ نوجوانوں کو ان کے کالج واسکول کے کام کی طرف لگاؤ پیدا کرنے میں، مضمون نگاری اور مقرری سکھانے میں، ان کو بری عادات جیسے قمار بازی کو ترک کرنے کی تلقین کرنے اور عام طور پر عمدہ اخلاقی و ذہنی ماحول پیدا کرنے میں ایسوسی ایشن کی خدمات خصوصاً اس کے ابتدائی زمانے میں بہت کامیاب ثابت ہوئی۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ زوال پذیر ہوگئی۔ نوجوانوں کے چال چلن کو صحیح طریقے پر ترقی دینے، ان کو زندگی کے بلند اور عالی خیالات پر کھنے اور جانچنے کی ترغیب دینے اور درحقیقت ان کو روحانیت سے متعارف کرنے کی کوشش ناکام ہوگئی۔ اس کی ایک نمایاں دلیل ممبران کے آپس کے تعلقات میں نظر آتی ہے۔''

چکبست کو شروع میں اپنے ہم قوموں سے کافی مدد ملی اور ان کو اُمید ہو چکی تھی کہ وہ اپنے اس اصلاحی عمل میں ضرور کامیاب ہوں گے۔ 1912 تک چکبست کلب کی ترقی سے مطمئن نظر آئے ہیں۔ 1912 میں کلب کے آٹھویں جلسے میں انھوں نے نظم ''دردول'' پڑھی تھی جس سے ان کے خیالات کا اظہار ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں:

قوم میں آٹھ برس سے ہے یہ گلشن شاداب
چہرۂ گل پہ یہاں پاس ادب کی ہے نقاب
میرے آئینۂ دل میں ہے فقط اس کا جواب
اس کے کانٹوں پہ کیا میں نے نثار اپنا شباب
کام شبنم کا لیا دیدۂ تر سے اپنے
میں نے سینچا ہے اسے خونِ جگر سے اپنے
ہر برس رنگ پہ آتا ہی گیا یہ گلزار
پھول تہذیب کے کھلتے گئے مٹتے گئے خار
پتی پتی سے ہوا رنگِ وفا کا اظہار
نوجوانانِ چمن بن گئے تصویرِ بہار
رنگِ گل دیکھ کے دل قوم کا دیوانہ ہوا
جو تھا بدخواہِ چمن سبزۂ بیگانہ ہوا
گو کہ باقی نہیں کیفیتِ طوفانِ شباب
پھنس کے جنجال میں دنیا کے یہ قصہ ہوا خواب
مست رہتا ہے مگر اب بھی دلِ خانہ خراب
شام کو بیٹھ کے محفل میں لنڈھاتا ہوں شراب
نشۂ علم کی امید پہ جینے والے
سٹ آئے ہیں سرِ شام سے پینے والے

قوم کی حالت چکبست اس طرح بیان کرتے ہیں:

گلشنِ قوم میں ہے پیشِ نظر رنگِ عجیب
فتنے جاگے ہوئے ہیں، خوابِ گراں میں ہے نصیب
دل محبت سے خفا ہیں تو مروت کے رقیب
دور ہیں دل سے جو آنکھوں سے ہیں ہر وقت قریب
اب وہ پہلے کی محبت وہ بھلائی ہے کہاں
دل کے آئینوں میں اگلی سی صفائی ہے کہاں
کوئی سودائے محبت کا خریدار نہیں
جوشِ الفت کی ذرا گرمیِ بازار نہیں
پیٹھ کے پیچھے برا کہنے میں کچھ عار نہیں
جو ہے رفتارِ خیالات وہ گفتار نہیں
فرق کیا ظاہر و باطن کا برا ہوتا ہے
جو زباں کہتی ہے دل سن کے اسے روتا ہے

غالباً کلب کے ممبران کی لاپرواہی اور اپنے پیشۂ وکالت کی مصروفیت کی وجہ سے چکبست 1916 سے کلب سے قریب قریب الگ ہوگئے۔ ان کا الگ ہونا تھا کہ کلب ختم ہوگیا۔ کلب کے اکثر ممبران بہ سلسلۂ معاش باہر بھی چلے گئے تھے، چکبست خود کشمیری محلے کی سکونت ترک کرکے گولہ گنج لکھنؤ میں قیام پذیر ہوگئے تھے۔ ان حالات نے اس شیرازے کو بالکل منتشر کردیا جو 1904 میں قائم ہوا تھا۔''(3)

□□□

پتہ:
Sanjay Kumar
Deptt. of Urdu,
Allahabad University,
Allahabad

عزیز اندوری

اردو شاعری اور علمِ طب

دنیا کے مختلف علوم میں علمِ شعروادب اپنی جامعیت کے سبب سب سے زیادہ لائقِ توجہ رہا ہے دیگر علوم کے لیے حد بندی کا تصوّر انھیں محدود کر دیتا ہے۔ وہ اسی حد بندی کے باعث ''مخصوص خصوصیات'' کے حامل نظر آتے ہیں۔ مثلاً تاریخ، جغرافیہ، سیاسیات، اقتصادیات، سماجیات، نفسیات، سائنس، فلسفہ، منطق یا دیگر مختلف علوم اپنے اپنے دائروں تک مخصوص معلومات بہم پہنچاتے ہیں اور وہ ایک دوسرے سے بہت کم مربوط رہتے ہیں لیکن شعروادب کا رشتہ تمام علوم وفنون سے بہت ہی گہرا ہوتا ہے۔ اسی لیے کسی بھی زبان کے ادیب اور شاعر جب تک اپنے زمانے کے تمام علوم سے کسی حد تک واقف نہ ہوں وہ اپنے تخلیقی عمل کو بلندیوں تک نہیں پہنچا سکتے۔

اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض زبانوں کے بعض شعرا وادبا کسی خاص علم سے عملی طور پر وابستہ ہوتے ہیں۔ خود ہندوستان میں کتنی ہی ایسی معتبر اور بزرگ ہستیاں پیدا ہوئیں جو ایک طرف دینی اعتبار سے اعلیٰ اوصاف کا نمونہ تھیں تو دوسری جانب علمِ شعروادب پر بھی ماہرانہ قدرت رکھتی تھیں۔ علمِ طب یونانی کو ہم طب کی ابتدا کے زمرے میں اوّلیت دے سکتے ہیں جس کی ابتدا یونان میں ہوئی۔ جہاں بقراط نے اسے ایک سائنسی حیثیت دی اور درج ذیل تین حصوں میں تقسیم کر دیا: کلیات، معالجات اور ادویات۔ بادی النظر میں اس علم کا تعلق یوں تو صحتِ انسانی سے ہے لیکن اس کا اطلاق ہر جاندار شے پر ہو سکتا ہے۔

اردو شاعری کی مختلف اوصاف میں کتنے ہی ایسے پہلو مل جاتے ہیں جو کسی نہ کسی طرح کہیں واضح انداز میں تو کہیں استعارات وتلمیحات کی شکل میں علمِ طب سے متعلق نظر آتے ہیں اردو شاعری بھی اپنے دکھوں کی دوا ابنِ مریم سے طلب کرتی نظر آتی ہے تو کبھی عطار کے ''لونڈے'' سے اپنے مرض کی دوا طلب کرنے پر شاعر کو اکساتی ہے۔ کہیں بیماریِ دل کے علاج کے لیے اختیار کی جانے والی ساری تدبیروں کو الٹا دیکھ کر ''دوا'' کے بے اثر ہو جانے پر اظہارِ تاسف کرتی ہے اور کہیں طبیب کے مقابلے میں کسی ''نازنیں'' کو بہتر معالج ثابت کرنے کے لیے شاعر کو اس طرح اکساتی ہے:

اس کی دوا جو ہو تو کسی نازنیں سے ہو
اے مہرباں یہ کام نہیں ہے طبیب کا (نظیر اکبرآبادی)

کہیں وہ حضرتِ عیسیٰ کے مقابلے میں اپنے محبوب کے معجزہ آرا لب کو اہمیت دیتے ہوئے شاعر سے اس قسم کے شعر کہلواتی ہے:

جب کھلے اس معجزہ آرا کے لب
بند ہوئے حضرتِ عیسیٰ کے لب (نظیر اکبرآبادی)

دل کا بیمار کشتۂ عشق ہوتا ہے۔ اسی لیے شاعر سمجھتا ہے کہ اس کے مرض کا علاج طبیب نہیں کر سکتا۔ نظیر اس خیال کو اس طرح پیش کرتے ہیں:

مرہم ہو کس طرح دلِ افگار کو پسند
آئی ہے کب شِفا دلِ بیمار کو پسند

اردو غزل میں اکثر دوا (اور دعا) کے مقابلے میں علاجِ دل کے لیے محبوب کی نگاہِ التفات کو اوّلیت دی جاتی رہی ہے۔ حسرت موہانی ایک جگہ فرماتے ہیں:

آپ کی ایک نظر کے یہ کرشمے ہیں تمام
صحتِ دل کی دوا ہے نہ دعا ہے باعث

مومن فرماتے ہیں:

بیمار اجل چارہ کو گر حضرتِ عیسیٰ
اچھا نہ کریں گے تو کچھ اچھا نہ کریں گے

اسی بات کو انھوں نے ایک جگہ اور بھی وضاحت کے ساتھ اس طرح پیش کیا ہے:

کیوں نہ کاٹیں لب اطبا، مرگیا
حال پوچھا تھا ترے بیمار سے

میر درد کا یہ شعر بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے:

ان لبوں نے نہ کی مسیحائی
ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

سودا کہتے ہیں:

دعویٰ مری صحت پہ مسیحا کو غلط ہے
بچتے نہیں دیکھا کوئی بیمارِ محبت

میرؔ شاکی ہیں:

چارہ گری بیماریِ دل کی رسمِ شہرِ حسن نہیں
ورنہ دلبرِ ناداں بھی اس درد کا چارہ جانے ہے

سودا نے اپنے ایک ''شہر آشوب'' میں علمِ طب کی باریکیوں سے اپنی باخبری کا ثبوت اس طرح دیا ہے:

صیغے پہ طبابت کے بھلا آدمی نوکر
سو دو سو روپے کا جو کسی عہدے کے بھاں ہے
صحبت ہے یہ اس سے، اگر آقا کے تئیں چھینک
آوے تو وہ اس پر بہ خشونت نگراں ہے
دیتے ہیں منگا تیروکماں ہاتھوں میں اس کے
ٹھنڈی ہوا آنے کا گر اس وقت گماں ہے

اور ما حضر اوپر جو وہ تواب کو دیکھے
کھانا تو یہ کھاتے ہیں پر اس کو خفقاں ہے
مطبوخ میں ہے خربزہ او رخربزہ پہ دودھ
ہے دودھ پہ مچھلی تس اوپر گاؤزباں ہے
یہ بھی تو نہیں ہے کہ اسی پر ہو تسلی
اس سب پہ نفخ کے لیے پھر جیسنی ناں ہے

طبی اصطلاحات کے حامل چند اور اشعار ملاحظہ کیجیے:

کھینچتا کیوں ہے عبث نازِ طبیب اے سودا
درد کو دل کے نہیں دردِ جگر سے پیوند
آج بیمار ترے کا ہے ترقی پر ضعف
صبح تھا زرد منہ اس کا سو ہوا شام سفید (سودا)
نہیں کہ وحشتِ دل چارہ گر نہیں ہے مجھے
جنونِ چارۂ وحشت مگر نہیں ہے مجھے (فانی)

صنف قصیدہ وہ صنف شاعری ہے جس میں سب سے زیادہ طبی اصطلاحات کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن حالی کا ایک ایسا شخصی مرثیہ بھی ہے جو انھوں نے حکیم محمود خاں دہلوی کی وفات پر کہا تھا اور جو ان کے دیوان میں شامل ہے اس مرثیے میں انھوں نے یوں تو حکیم صاحب کو خراج عقیدت پیش کیا ہے لیکن اس میں علم طب کی خصوصیات بھی بیان کردی ہیں۔ نیز اس بات کی وضاحت بھی کردی ہے کہ ایک اچھے طبیب کی شخصیت میں کن کن صفات کا ہونا ضروری ہے:

طب میں گو یونانیوں کا سب سے آگے ہے قدم
آن کر اس نے لیا تھا دوسرا تجھ میں جنم
ہند میں جاری تجھی سے طب یونانی ہوئی
شہر شہر اس جنس کی یاں تجھ سے ارزانی ہوئی
اس کا تھا دیوان خانہ ملک کا دارالشفا
خلق کا دن رات رہتا تھا جہاں تانتا لگا
مفت بیماروں کو اس کے در سے ملتی تھی دوا
فکر نذرانے کا تھا ان کو نہ شکرانے کا تھا
اس کے استغنا سے جھک جاتا تھا سر مغرور تھا
اس کی شفقت سے کنول جاتا تھا کھل مزدور کا
رکھتے ہیں آلات پر سرجن بھروسا جس قدر
کرتے ہیں معلوم ان سے جو جو امراضِ بشر
وہ بتادیتا تھا سب کچھ رکھ کے انگلی نبض پر
اس کی اک انگلی پہ تھے قربان سو تھرمامیٹر
ساتھ تھیں سو دو بینیں اہلِ صنعت کی جہاں
جا پہنچتی تھی نگاہ دوربیں اسکی وہاں

علم طب کا ذکر صنف قصیدہ میں تفصیل کے ساتھ نظر آتا ہے۔ اردو کے بیشتر قصیدہ نگاروں نے اس علم کو اس کے سارے اوصاف کے ساتھ اپنے قصائد میں پیش کیا ہے۔ ان میں اردو کے مشہور قصیدہ گو سودا اور ذوق سب سے آگے نظر آتے ہیں۔ ان کے ان قصائد کے مطالعے سے جن میں علمِ طب کی اصطلاحوں کا ذکر آیا ہے، اس بات کا اندازہ آسانی سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان دونوں کو علمِ طب اور اس سے متعلق سارے پہلوؤں کے بارے میں مکمل واقفیت تھی۔ چند مثالیں یہاں پیش کی جاتی ہیں۔

سودا اپنے ایک قصیدے بہ عنوان ''باب الجنت'' (منقبت حضرت علیؓ) میں حضرتِ علیؓ کی عظمت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

رائے تیری کے موافق جو نہ لکھے نسخہ
کرتے تاثیر نہ عیسیٰ کا مداوا بہ کسل

اسی قصیدے کی تشبیب کا ایک شعر ہے:

دمِ عیسیٰ سے فزوں فیض ہوا ہے یاں تک
دین میں قسمِ جمادات سے شاید ہو خلل

بہادر شاہ ظفر کی مدح میں ذوق کے ایک قصیدے کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

کبھی کرتا تھا میں قانون سے تشریحِ علاج
کبھی کرتا تھا میں قاموس سے تصحیحِ لغت
کبھی میں لون سے بنیدۂ بیمار و صحیح
کبھی میں نبض سے دانندۂ ضعف و قوت
علم سے ہو نہ کبھی چارۂ آزار نصیب
پور سینا ہے تو کیا، سینے میں ہے خوں حسرت
سودوائیں ترے نسخے پہ ہوں پر بے تقدیر
نہ ہو بالخاصہ تاثیر نہ بالکیفیت

ایک اور قصیدے میں اپنے ممدوح بہادر شاہ ظفر کی مدح کرتے ہوئے کہا ہے:

عجب نہیں یہ ہوا ہے، کہ مثلِ نبضِ صحیح
کرے اگر حرکت موجِ چشمۂ تصویر
شہنشہا! ترے یمنِ شفائے کامل سے
جو لا علاج مرض تھے وہ ہیں علاج پذیر

ایک اور قصیدے میں کہتے ہیں:

تیری تاثیر محبت نے دیا ہے تریاک
ورنہ تھا زہر دلوں کو خطِ سبزِ خوباں
افقِ صبح سے کافور کالے کے مرہم
رکھتا مہتاب ہے بر سینۂ صد چاک کتاں

اسی کے ساتھ مولوی اسماعیل میرٹھی طبابت کی قدیم اور محدود روش سے اس طرح اختلاف کرتے نظر آتے ہیں:

اسی روش پہ اطبا کا ہے مرض مزمن
ہنوز نبضِ طبابت کی سست ہے رفتار
وہی سدیدی و قانون و تحفہ و مخزن
خدا نے ان پہ لگا دی ہے مہرِ استمرار
مجربات وہی اور وہی ہیں دستورات
انھیں بھی مردہ پرستی کا ہے بڑا آزار
وہی ہے فسد، وہی منضج او روہی مسہل
وہی سنادِ گلِ سرخ و شربتِ دینار
معالجے میں ترقی نہ کچھ مداوا میں
وہی سبب، وہی تشخیص اور وہی تیمار
غذا بتائیں وہی دال مونگ یا کھچڑی
بلا سے ان کے مرے یا جیے کوئی بیمار
اگر مریض کی قسمت سے ہوگیا بحران
تو راس آئی دوا اور نہ اشتدادِ بخار
نہ کچھ دوا کی ہے تحقیق، نے دواسازی
وہی دوا ہے جو پڑیا میں باندھ دے عطار
نہ ٹھیک طور سے اجسام کی ہوئی تشریح
نہ تیز فنِ جراحت کے کرسکے اوزار
نہ کیمیا کے ہوئے حل و عقد سے آگاہ
نہ مفردات کی ترکیب کے کھلے اسرار
فنِ قبالہ میں کچھ دستِ قابلیت ہے
نہ ان کی شرحِ نباتات پر نظر زنہار
توہمات بھی شامل ہیں یاں طبابت میں
بڑا طبیب ہے گر ہو منجم و عطار
نظر بروج کواکب پہ کرنے دے سختہ
کہ ہیں دوا پہ موثر نجوم کے آثار

مولانا اسماعیل کے نشانے پر وہ روایت پسند اطبا ہیں جنھیں لکیر کا فقیر کہا جاسکتا ہے اور جو علمِ طب کی توسیع وتجدید کی ضرورت سے بے خبر ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے اہم ذوق کا وہ قصیدہ ہے جو انھوں نے بہادر شاہ کے صحت یاب ہوجانے کے موقع پر کہا تھا۔ اپنے اس قصیدے میں انھوں نے طبّی اصطلاحات کا بڑا فنکارانہ استعمال کیا ہے۔ انسانی جسم میں چار اخلاط ہیں:

(1) خلطِ سودا، (2) خلطِ خون، (3) خلطِ صفرا، (4) خلطِ بلغم

ان اخلاط کی کمی وبیشی کا سیدھا اثر انسان کی جسمانی صحت پر پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر خلطِ سودا جس کا رنگ سیاہ ہوتا ہے، انسان کو مجذوبانہ حرکتیں کرنے پر اکساتا ہے۔ خلطِ صفرا جس کا رنگ پیلا ہوتا ہے اس کی زیادتی کے باعث انسان کا رنگ پیلا پڑ جاتا ہے۔ خلطِ بلغم کا رنگ سفید ہوتا ہے جس کی زیادتی سے انسان کا جسم سفید ہونے لگتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے اس کے قصیدے کے دو اشعار جن میں انھوں نے ان ساری صورتوں کا ذکر کیا ہے۔ خلطِ سودا سے متعلق:

ہوگیا زائل مزاجِ دہر سے یاں تک جنوں
بیدِ مجنوں کا بھی صحرا میں نہیں باقی پتا

خلطِ صفرا

پائی یہ اصلاح صفرا نے کہ دنیا میں کہیں
زرد چشم اب دیکھنے کو بھی نہیں ہے کہربا

خلطِ بلغم پر اس طرح روشنی ڈالی ہے:

ہر مزاجِ بلغمی میں ہوتی ہے تولیدِ خوں
چاندنی کا پھول ہو گر ارغوانی، ہے بجا

اور ان کا یہ استادانہ انداز ملاحظہ کیجیے:

فرق جا پایاں تک اعضائے بدن سے درد نے
درد کے جو حرف ہیں وہ آپ ہی ہیں سب جدا
لاغروں کو ہو کمالِ تاب و طاقت یہ شتاب
کیسے دو ہفتہ ہلال اک شب میں ہو بدرالدجا

اپنے کسی قصیدے میں ذوق نے چند اور بھی طبّی اصطلاحات کا استعمال چابک دستی کے ساتھ کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

صبحِ صادق کے ہے سر میں گو سپیدی آگئی
لیکن اس پیری میں بھی صادق ہے اس کی اشتہا
رات بھر ٹونگا کیا انجم کے دانے چرخِ پیر
پھر جو دیکھا صبح کو اصلا شکم میں کچھ نہ تھا
پہنچی یہ تنقیح کی نوبت کہ نوبت خانے میں
لیتی ہے جی کھول کر کیا کیا ڈکاریں کرنا
ہضمِ کامل اس قدر معدے نے پہنچایا بہم
جید الکیموس ہے جو حلق سے اُتری غذا
تقویت کا یہ اثر ہو عام جو ہیں برگِ زرد
ہوں مقویِ دل و جاں مثلِ اوراقِ طلا

ان مثالوں سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اردو شاعری میں علمِ طب کے جو حوالے آئے ہیں وہ ان شعرا کی علمِ طب سے ذہنی مناسبت کے ساتھ ہی ان کی وسیع معلوماتِ علمیت کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں۔ اردو شاعری میں دیگر علوم کا ذکر بھی تواتر کے ساتھ آیا ہے۔ اور اس طرح اس کی علمی حیثیت میں اضافہ ہوگیا ہے۔

□□□

پتہ:
45, Shalimar Colony,
Khajrana-INDORE-16

اشرف علی خاں فغاں

کلاسیکی ادب

غزلیں

اشرف علی خاں فغاں کا بچپن قلعۂ معلّیٰ میں بسر ہوا تھا اس لیے ان کی زبان اور محاورے کو مستند مانا جائے گا، ان کے کلام کا مطالعہ ہمیں اردو کے محاورے روزمرّہ اور لب و لہجے کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

احمد شاہ کے عہدِ حکومت (1167-1161ھ/1754-1748) تک اشرف علی خاں فغاں دلّی میں تھے پھر کچھ ایسے حالات ہوئے کہ وہ دلّی سے دل اٹھا کر اودھ کی طرف چلے گئے۔ میر محمد نعیم خاں کے بیٹے نے نواب شجاع الدولہ سے ان کا تذکرہ کرکے انھیں نواب کے مقربین میں شامل کرادیا۔ شجاع الدولہ کے مزاج اور کردار سے تاریخ کے طالب علم خوب واقف ہیں۔ وہ بظاہر کوکا ہونے کی وجہ سے ان کی قدرومنزلت جانتا تھا مگر ممکن ہے کسی سبب سے کدورت رکھتا ہو، ایک دن ہنسی ہنسی میں چھلا گرم کرکے ان کی کلائی داغ دی۔ یہ اس زمانے کی تہذیب میں اظہارِ عشق کی علامت تھی، حسینوں سے چھلّے کے داغ لگوائے جاتے تھے۔ اردو کا محاورہ ''گل چھلّے اُڑانا'' اسی سے بنا ہے۔ بہرحال اشرف علی خاں ان حرکتوں سے بیزار ہوکر 1177ھ مطابق 1763 میں عظیم آباد (پٹنہ) چلے گئے۔ اس وقت وہاں کے ناظم صوبہ لالہ شتاب رائے تھے انھوں نے اشرف علی خاں سے بہت اچھا سلوک کیا۔ شاہ عالم بھی ان دنوں پٹنہ میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔ شتاب رائے نے انھیں ظریف الملک کا خطاب دلوایا اور دو تین دیہات بھی جاگیر میں مل گئے۔ اس طرح اشرف علی خاں فراغت سے بسر کرنے لگے۔ انھوں نے وہاں اپنا مکان بھی بنوا لیا تھا اور ان کی اولاد بھی پٹنہ میں موجود تھی۔

(نثار احمد فاروقی، بحوالۂ دیوانِ فغاں شائع کردہ قومی اردو کونسل)

آیا ہے خط نمود میں اس خوش نگاہ کا
شاید اثر ہوا ہے مرے دودِ آہ کا
خورشید بھی نہ ہووے ہویدا سحر کے وقت
گر نام لے کوئی مرے بختِ سیاہ کا
آجاوے درمیان میں دامانِ حشر بھی
اتنا ہے چاکِ جیب ترے داد خواہ کا
اے شہ گدا کے خرقۂ پشمیں کے روبرو
کیا پشم وقر ہے تری زرّیں کلاہ کا
جو لختِ دل گرا ہو زمیں پر اسے فغاں
رکھنا مرے کفن میں یہ توشہ ہے راہ کا

●

خون آنکھوں سے نکلتا ہی رہا
کاروانِ اشک چلتا ہی رہا
اس کفِ پا پر ترے رنگِ حنا
جن نے دیکھا، ہاتھ ملتا ہی رہا
صبح ہوتے بجھ گئے سارے چراغ
داغِ دل تا شام جلتا ہی رہا
کب ہوا بیکار پُتلا خاک کا
یہ تو سو قالب میں ڈھلتا ہی رہا
ہرِ ہوئے کب داغ میرے جسم کے
یہ شجر ہر وقت پھلتا ہی رہا
کب تھما آنکھوں سے میری خونِ دل
جوش کھا کھا کر ابلتا ہی رہا
کیا ہوا مرہم لگانے سے فغاں
زخمِ دل سینہ میں سلتا ہی رہا

●

ڈپٹی نذیر احمد

نصوح کا خواب

ایک برس دہلی میں ہیضے کی بڑی سخت وبا آئی۔ نصوح نے ہیضہ کیا اور سمجھا کہ مرا چاہتا ہے۔ یاس کے عالم میں اس کو مواخذۂ عاقبت کا تصور بندھا۔ ڈاکٹر نے اس کو خواب آور دوا دی تھی۔ سو گیا تو وہی تصور اس کو خواب موحش بن کر نظر آیا۔ اب سے دور ایک سال دہلی میں ہیضے کا اتنا زور ہوا کہ ایک حکیم بقا کے کوچے سے ہر روز تیس تیس چالیس چالیس آدمی کھینچے لگے۔ ایک بازار موت تو البتہ گرم تھا ورنہ جدھر جاؤ سناٹا اور ویرانی، جس طرف نگاہ کرو وحشت و پریشانی۔ جن بازاروں میں آدھی آدھی رات تک کھوے سے کھوا چھلتا تھا، ایسے اجڑے پڑے تھے کہ دن دوپہر جاتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا تھا۔ کٹوروں کی جھنکار موقوف، سودے والوں کی پکار بند، ملنا جلنا اختلاط و ملاقات، آمد و شد بیمار پُرسی و عیادت، بازدید و زیارت، مہمانداری و ضیافت، کُل رسمیں لوگوں نے اٹھا دیں۔ "ہر شخص اپنی حالت میں مبتلا، مصیبت میں گرفتار، زندگی سے مایوس، کہنے کو زندہ پر مردے سے بدتر، دل میں ہمت نہ ہاتھ پاؤں میں سکت یا تو گھر میں اٹوانٹی کھٹوانٹی لے کر پڑ رہا یا کسی بیمار کی تیمارداری کی یا کسی یار آشنا کا مرنا یاد کر کے کچھ رو پیٹ لیا۔ مرگ مفاجات حقیقت میں انھیں دنوں کی موت تھی۔ نہ سان نہ گمان، اچھے خاصے چلتے پھرتے یکا یک طبیعت نے مالش کی، پہلی ہی کلی میں حواس خمسہ مختلف ہو گئے۔ اِلّا ماشاء اللہ کوئی جزئی بچ گیا تو بچ گیا ورنہ جی کا متلانا اور قضائے مبرم کا آجانا، پھر وصیت کرنے تک کی مہلت نہ تھی۔ ایک پاؤ گھنٹے میں تو بیماری، دوا، دعا، جانکنی اور مرنا سب کچھ ہو چکتا تھا۔

غرض کچھ اس طرح کی عالمگیر وبا تھی کہ گھر گھر اُس کا رونا پڑا تھا۔ دو پونے دو مہینے کے قریب وہ آفت شہر میں رہی مگر اتنے ہی دنوں میں شہر کچھ ادھیا سا گیا۔ صد ہا عورتیں بیوہ ہو گئیں، ہزاروں بچے یتیم بن گئے۔ جس سے پوچھو شکایت، جس سے سنو فریاد مگر ایک نصوح جس کا قصہ ہم اس کتاب میں لکھنے والے ہیں کہ عالم شاکی تھا اور وہ اکیلا شکرگزار، دنیا فریادی تھی اور وہ تنہا مداح۔ نہ اس سبب سے کہ اس کو اس آفت سے گزند نہیں پہنچا، خود اس کے گھر ہی اکٹھے تین آدمی اسی وبا میں تلف ہوئے۔ اچھی خاصی طرح گھر بھر رات کو سو کر اٹھے۔ نصوح نمازِ صبح کی نیت باندھ چکا تھا۔ باپ بیٹھے وضو کر رہے تھے، مسواک کرتے کرتے اُبکائی آئی، ابھی نصوح دوگانۂ فرض ادا نہیں کر چکا تھا، سلام پھیر کر دیکھتا کیا ہے باپ نے قضا کی۔ اُن کو مٹی دے کر آیا تو رشتے کی ایک خالا تھیں ان کو جاں بحق پایا۔ تیسرے دن گھر کی ماما رخصت ہوئیں۔ مگر نصوح کی شکرگزاری کا کچھ اور ہی سبب تھا۔ اس کا مقولہ یہ تھا کہ ان دونوں لوگوں کی طبیعتیں بہت کچھ راستی پر آگئی تھیں۔ دلوں میں رقت و انکسار کی وہ کیفیت تھی کہ عمر بھر کی ریاضت سے پیدا ہونی دشوار ہے۔ غفلت کو ایسا کاری تازیانہ لگا تھا کہ ہر شخص اپنے فرائض مذہبی کے ادا کرنے میں سرگرم تھا۔ جن لوگوں نے رمضان میں بھی نماز نہیں پڑھی تھی، وہ بھی پانچوں وقت سب سے پہلے مسجد میں آموجود ہوتے تھے۔ جنھوں نے بھول کر بھی سجدہ نہیں کیا تھا، ان کا اشراق و تہجد تک قضا نہیں ہونے پاتا تھا۔ دنیا کی بے ثباتی، تعلقات زندگی کی ناپائیداری سب کے دل پر منقش تھی۔ لوگوں کے سینے صلح کاری کے نور سے معمور تھے۔ غرض ان دنوں کی زندگی اس پاکیزہ اور مقدس اور بے لوث زندگی کا نمونہ تھی جو مذہب تعلیم کرتا ہے۔ نصوح یوں ہی دل کا کچا تھا۔ جب اس نے اوّل اوّل ہیضے کی گرم بازاری سنی، سرد ہو گیا اور رنگت زرد پڑ گئی۔ باسباب ظاہر جو جو تدبیریں انسداد کی تھیں، سب کیں۔ مکان میں نئی قلعی پھروا دی، پاس پڑوس والوں کو صفائی کی تاکید کی، گھر کے کونوں میں لوبان کی دھونی دے دی، طاقوں میں کافور رکھوا دیا، جابجا کوئلہ ڈلوا دیا، باورچی سے کہہ دیا کہ کھانے میں ذرا نمک تیز رہا کرے، پیاز اور سرکہ دونوں وقت دسترخوان پر آیا کرے۔ گلاب، نارجیل دریائی، بادیان، تمر ہندی سکنجبین وغیرہ، جو جو دوائیں یونانی طبیب اس مرض میں استعمال کرتے ہیں، تھوڑی تھوڑی سب بہم پہنچا لیں، تاکہ خدانخواستہ ضرورت کے وقت کوئی چیز ڈھونڈنی نہ پڑے۔ نصوح نے یہاں تک اہتمام کیا کہ انگریزی دوائیاں بھی فراہم کیں۔ کالرا پل کی گولیاں تو وہیں کوتوالی سے لے لیں۔ کالرا مکسچر الہ آباد میڈیکل ہال سے روپیہ بھیج کر منگوا رکھا۔ آگرے سے ایک دوست کی معرفت کلوروڈائن کی دو شیشیاں خرید لیں۔ ایک اخبار میں لکھا دیکھا کہ بنارس میں ایک بنگالی عجیبی علاج کرتا ہے اور سرکار سے جو دس ہزار روپے کا انعام موعود ہے، اس کا دعویدار ہوا ہے، چٹھی لکھ کر اُس کی دوا بھی طلب کی۔ نصوح کو ایک وجہ تسلی یہ بھی تھی کہ ایک طبیب حاذق اسی کے ہمسائے میں رہتا تھا۔ گور و سیاہ ہیضے کے توڑنے کے واسطے اتنا سامان وافر موجود تھا مگر آخر نصوح کا گھر بھی فرشتوں کی نظر سے نہ بچا۔ باپ کی اجل آئی تو دوائیں رکھی ہی رہیں۔ دینے اور پلانے کی نوبت بھی نہ پہنچی کہ بڑے میاں سسکیاں لینے لگے۔ وہ رشتے کی خالہ کچھ تھوڑی دیر سنبھلی تھیں لیکن وہ کچھ ایسی زندگی سے سیر تھیں کہ انھوں نے خود خبر کرنے میں دیر کی۔ غرض دوا اُن کو بھی نصیب نہ ہوئی۔ ماما نے البتہ انگریزی یونانی سب طرح کی دوائیں ڈھکوسیں مگر اُس کی عمر ہو چکی تھی۔ اول اول نصوح کو اپنی احتیاط پر کچھ یوں ہی سا تکیہ ہوا تھا

مگر جب وبا کا بہت زور ہوا اور خود اسی کے گھر میں تابڑ توڑ ایک چھوڑ تین تین موتیں ہوگئیں تو ناچار تن بہ تقدیر صبر و شکر کر کے بیٹھ رہا۔ غرض پورا ایک چلہ شہر پر سختی و مصیبت کا گزرا۔ نہیں معلوم کتنے گھر غارت ہوئے کس قدر خاندان تباہی میں آ گئے۔ یہاں تک کہ نواب عمدۃ الملک نے ہیضہ کیا۔ کوئی دو تین گھڑی دن چڑھتے چڑھتے شہر میں یہ خبر مشہور ہوئی اور نماز جمعہ کے بعد دیکھتے ہیں تو جنازہ جامع مسجد کے صحن میں رکھا ہے۔ یوں تو ہزار ہا آدمی شہر میں تلف ہوئے مگر عمدۃ الملک کی موت سب پر بھاری تھی۔ اول تو ان کی ٹکر کا شہر میں کوئی رئیس نہ تھا، دوسرے ان کی ذات سے غریبوں کو بہت کچھ فائدہ پہنچتا تھا۔ گو ان کے مرنے کا گھر گھر ماتم تھا۔ لیکن لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ بس اب خدا نے ٹھنڈک ڈالی کیونکہ معتقدات عوام میں یہ بھی ہے کہ وبا بے کسی بڑے رئیس کے بھینٹ لیے نہیں جاتی۔

خیر لوگوں نے جو کچھ سمجھا ہو یوں بھی شورش بہت کچھ فرو ہو چکی تھی اور امن و امان ہوتا جاتا تھا۔ لوگوں نے دکانیں بھی کھولنی شروع کر دیں اور دنیا کا کاروبار پھر جاری ہو چلا۔ انھیں دنوں نصوح نے اپنی بیوی سے کہا کہ دو مہینے سے چاولوں کو ترس گئے۔ اب خدا نے اپنا فضل کیا، آج زردہ پکواؤ مگر تاکید کرنا کہ چاول کھڑے نہ رہیں۔ شام کو زردہ پکا اور گھر کے چھوٹے بڑے سب نے کھایا اور حسب عادت سو رہے۔ کوئی پہر رات باقی رہی ہوگی کہ دفعتاً نصوح کی آنکھ کھل گئی۔ جاگا تو پیٹ میں آگ بھڑکی ہوئی تھی، اٹھتے اٹھتے کئی مرتبہ طبیعت نے مالش کی۔ اس نے ننگے سر جلدی سے صحن میں نکل کر ٹہلنا شروع کیا۔ خوب کس کر دونوں بازو باندھے، گلے میں توے کی سیاہی تھوپی، عطر کا پھویا ناک میں رکھا اور طبیعت کو دوسری طرف مصروف کیا مگر معلوم ہوتا تھا کہ حلق تک کوئی چیز بھری ہوئی ہے۔ بہتیرا ضبط کیا بہتیرا ٹالا، آخر بڑے زور سے استفراغ ہوا۔ گھر والے سب جاگ اٹھے۔ نصوح کو اس حالت میں باہر بیٹھا ہوا دیکھ سب کے کلیجے دھک سے رہ گئے۔ کوئی پانی اور بیسن لے کر دوڑا، کوئی الائچی ڈال پان بنا کر پاس آ کھڑا ہوا، کوئی پنکھا جھلنے لگا۔ نصوح کو تو لا کر چارپائی پر لٹایا اور اب سب لوگ لگے اپنی اپنی تجویزیں کرنے کسی نے کہا خیریت ہے غذا تھی، کوئی بولا زردے میں گھی بُرا تھا، کوئی کہنے لگا کھرچن کا فساد ہے۔ غرض یہ صلاح ہوئی کہ ہیضہ وبائی نہیں ہے۔ گلاب اور سونف کا عرق دیا جائے اور گھبرانے کی بات نہیں، صبح تک طبیعت صاف ہو جائے گی۔

خیر یہ تو تیمارداروں کا حال تھا۔ نصوح اگرچہ تکان کی وجہ سے مضمحل ہو گیا تھا مگر ہوش و حواس سب خدا کے فضل سے برجا تھے۔ سب کی صلاحیں اور تجویزیں سنتا تھا اور دوا جو لوگ پلاتے تھے پی لیتا تھا۔ لیکن استفراغ ہونے کے ساتھ ہی اس نے کہہ دیا تھا کہ لو صاحب خدا حافظ ہم بھی رخصت ہوتے ہیں۔ استفراغ امتلائی مجھ کو بارہا ہوئے ہیں مگر اس وقت میرا جی اندر سے بیٹھا جاتا ہے اور ہاتھ پاؤں میں سنسنی سی چلی آتی ہے۔ اتنا کہنے کے بعد تو نصوح دوسری ہی ادھیڑ بن میں لگ گیا اور سمجھا کہ بس دنیا سے چلا۔ صبح ہوتے ہوتے روائت کے کل آثار پیدا ہو گئے۔ برد، اطراف، تشنج، ضعف، متلی، اسہال، تشنگی، ہر ایک کیفیت اشتداد پر تھی۔ منہ اندھیرے آدمی حکیم کے پاس دوڑا گیا۔ حکیم جی خود خفقانی المزاج ہیضے کے نام سے کوسوں بھاگتے تھے مگر ہمسائیگی، مدت کی راہ و رسم، طوعاً و کرہاً آئے اور کھڑے کھڑے چھدا سا اتار کر چلے گئے۔ بیمار میں تو بولنے اور بات کرنے کی بھی طاقت نہ تھی، ایک پہر ہی بھر کی بیماری میں چارپائی سے لگ گیا تھا، عورتوں نے پردے میں سے جہاں تک اُس گھبراہٹ میں زبان نے یاری دی کہا لیکن حکیم صاحب یہی کہے چلے گئے کہ برف کے پانی میں نارجیل دریائی گھس گھس کر پلائے جاؤ۔ تیمارداروں کو ایسی سرسری تشخیص اور ایسی رواداری کی تجویز سے کیا خاک تسلی ہوتی، فوراً آدمی کو شفاخانے دوڑایا اور ڈاکٹر دوا لے سدا کی طرح آ موجود ہوا۔ اوپر تلے چار پڑیاں تو اس نے اپنے سامنے پلائیں۔ چلتے ہوئے ایک عرق دیتا گیا کہ پاؤ گھنٹے بعد پلا کر مریض کو علیحدہ مکان میں اکیلا لٹا دینا۔ کوئی آدمی اس کے پاس نہ رہے تاکہ اس کو نیند آ جائے۔ اگر سو گیا تو جاننا کہ بچ گیا۔ فوراً ہم کو خبر دینا ڈاکٹر کے حکم کے مطابق نصوح کو اکیلے دالان میں سلا کر لوگ اِدھر اُدھر ٹل گئے مگر دبے پاؤں آ کر دیکھ دیکھ جاتے تھے۔ نصوح کے دل کی جو کیفیت تھی وہ البتہ عبرت انگیز تھی۔ یہ کچھ تو بیماری کا شداد ہوا مگر ہوش و حواس سب بدستور تھے۔ وہ اپنے خیال میں ڈوبا ہوا تھا۔ لوگ جانتے تھے کہ غش میں پڑا ہے۔

ابتدا میں تو نصوح بھی اپنی نسبت مرنے کا تصور کرنے سے گریز کرتا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ اپنے تئیں مرنے والا سمجھے بلکہ جو لوگ اس کی علالت کو سوء ہضم اور امتلا کی وجہ سے تجویز کرتے تھے، دل میں ان کی رائے کی تحسین کرتا تھا۔ لیکن افسوس یہ مسرت نصوح کو بہت ہی ذرا سی دیر تک نصیب ہوئی۔ دمبدم اس کی حالت ایسی ردی ہوتی جاتی تھی کہ زندگی کے تمام تر احتمالات ضعیف تھے۔ آخر چار و ناچار اس کو سمجھنا پڑا کہ اب میں دنیا میں چند ساعت کا مہمان اور ہوں۔ اذعان مرگ کے ساتھ پہلا قلق اس کو دنیا کی مفارقت کا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ مرنا وہ سفر ہے کہ جس کا انقطاع نہیں، وہ جدائی ہے کہ جس کے بعد وصال نہیں، وہ گم شدگی ہے جس کی کبھی بازیافت نہیں، وہ غشی ہے جس سے افاقہ نہیں، وہ بیگانگی ہے جس کے پیچھے کچھ تعلق نہیں۔ کبھی وہ بیوی بچوں کو دیکھ کر روتا اور کبھی ساز و سامان دنیا پر نظر کر کے سر کو دھنتا اور کہتا:

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

جس جس پہلو سے غور کرتا تھا، اپنا مرنا اس کو بے وقت معلوم ہوتا تھا۔ بیوی کو دیکھ دیکھ کر اپنے جی میں سوچتا تھا کہ بھلا کوئی اس کی عمر بیوہ ہونے کی

ہے۔ نہ تو اس کے میکے میں کوئی اتنا ہے کہ اس کا متکفل ہو، نہ بیٹوں میں کوئی اس قابل ہے کہ گھر کو سنبھال لے۔ اندوختہ جو ہے سو واجبی ہی واجبی ہے، کب تک اکتفا کرے گا۔ دونا کدخدا بیٹیاں اس کے آگے ہیں، کچا ساتھ خالی ہاتھ، بچوں کی پرورش، کہیں سے کوڑی کی آمد کا آسرا نہیں۔ کیا ہوگا اور کیوں کر یہ پہاڑ زندگی اس کے کاٹے کٹے گی۔ بڑا لڑکا تو پہلے ہی گویا ہاتھ سے جا چکا ہے۔ رہا منجھلا امسال انٹرنس پاس کرنے کو تھا اور امید تھی کہ یہ کچھ ہوگا مگر اب وہ تمام منصوبہ ہی غلط ہوا چاہتا ہے۔ میری آنکھ بند ہوئی تو کیسا پڑھنا اور کس کا امتحان۔ یہ دو لڑکیوں کا فرض کیسا میں اپنی گردن پر لے چلا۔ بڑی لڑکی کی نسبت کن کن مصیبتوں سے ٹھہری تھی اور جب میرے رہتے یہ دقت تھی تو اب ان دو بچیوں کا دیکھیے کیا ہو؟ پیش بینی اور مآل اندیشی کرکے پارسال گانوں لیا تھا ابھی تک پٹی داروں نے اس میں اچھی طرح تسلط نہیں جمنے دیا۔ اب جو چالیس پچاس بیگھ سیر کرکے نیل بولیا تھا، وہ سب گیا گزرا ہوا۔ گودام پر جو روپیہ لگا دیا تھا وہ بھی ڈوبا۔ رہنے کے مکان میں کس تنگی سے بسر ہوتی ہے۔ کوئی مہمان آنکلتا ہے تو شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ شمال رویہ دالان در دالان بنوانے کا ارادہ تھا۔ ڈیڑھ دون لکڑی کا روپیہ بھیج چکا ہوں وہ نہیں آئی۔ پزاوے والوں کو اینٹوں کی دادنی دی تھی وہ نہیں پٹی۔ افسوس کہ موت نے مجھ کو مہلت نہ دی۔ لوگوں کا لینا دینا، حساب کتاب بڑے بڑے بکھیڑے ہیں۔ آج سمجھانے بیٹھوں تو مہینوں میں جاکر طے ہوں تو ہوں۔ اجل سر پر آپہنچی۔ تمام لینا لوانا مارا پڑا۔ اے کاش میں نہیں تو دس بارہ برس ہی اور جی جاتا تو یہ سب انتظام اپنی خواہش کے مطابق درست کرلیتا۔ بال بچے بھی ذرا اور سیانے ہوجاتے، کھانے کمانے لگتے۔ ادھر ان کے شادی بیاہ کر چکتا، گانوں کا معاملہ بھی رو براہ ہوجاتا۔ مکان کو اپنے طور پر بنا لیتا۔ لوگوں کا حساب کتاب، سب صاف کردیتا۔ گھر والی کے واسطے کچھ ذخیرۂ وافی فراہم کرجاتا، تب فراغت سے مرتا۔ کیا مرنے میں مجھ کو کچھ عذر یا خدانخواستہ کسی طرح کا انکار تھا یا میں اتنی ذرا سی بات نہیں سمجھتا کہ دنیا میں آکر مرنا ضرور ہے مگر ہر چیز ایک وقت مناسب پر ٹھیک ہوتی ہے۔ یہ بھی کوئی مرنا ہے کہ ہر ایک کام کو ادھورا، ہر ایک انتظام کو ناقص و ناتمام چھوڑ کر چلا جاؤں۔ ایسا بے ہنگام مرنا نہ صرف میرے لیے بلکہ تمام متعلقین اور وابستگان کے لیے موجب زیاں و باعث نقصان ہے۔

اگرچہ نصوح بنظر ظاہر ایک آزاد اور بیگانہ وار زندگی بسر کرتا تھا، نہ تو ہر وقت گھر میں گھسے رہنے کی اس کی خو تھی، نہ بال بچوں ہی سے کچھ بہت اختلاط کرنے کی عادت۔ انتظام خانہ داری میں بھی بی بی کے تقاضے اور اصرار سے بقدر ضرورت کچھ دخل دیا تو دیا ورنہ اس کی بھی چنداں پروا نہ تھی۔ اور یہی سبب تھا کہ جب کبھی سننے کا اتفاق ہوتا کہ فلاں شخص نے بڑی حسرت کے ساتھ جان دی تو نصوح کو تعجب ہوتا اور کہتا کہ خدا کی شان ہے ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں کہ دنیا سے نکلنے کو ان کا جی ہی نہیں چاہتا، نہیں معلوم دنیا کی کون سی ادا ان کو پسند ہوتی ہے ورنہ استغفراللہ یہ دارالمحن، انسان کے رہنے کے لائق ہے؟ صدہا بکھیڑے، ہزار ہا مخمصے، روز کے جھگڑے، آئے دن کی مصیبت، سچ ہے خدائے تعالیٰ کا کوئی فعل حکمت اور بندوں کی مصلحت سے خالی نہیں۔ ظاہر میں تو موت سب کو بری معلوم ہوتی ہے اور اس سے لوگ ایسا ڈرتے ہیں جیسے مجرم سزا سے لیکن غور کرکے دیکھوں تو مرنا بھی ایک نعمت ہے۔ انسان کی طبیعت تازگی پسند واقع ہوئی ہے، جہاں ایک حالت سالہا سال رہی گو وہ حالت کیسی ہی عمدہ اور پسندیدہ کیوں نہ ہو، خواہ مخواہ آدمی اس سے ملول ہوجاتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہمراہی من و سلویٰ کھاتے کھاتے ایسے اکتائے کہ آخر کو ان کے دل لہسن اور پیاز پر للچائے۔ اگر دنیا میں موت نہ ہوتی تو آدمی کنوؤں میں کود کود کر اور درختوں سے گر گر کر جان دیتے اور حیات دراز کو عذاب مقیم سمجھتے۔ میرے دل کی تو یہ کیفیت ہے کہ مجھ کو یہاں سے چلے جانے کی مطلق پروا نہیں اور کسی چیز کو میں نہیں سمجھتا کہ مجھ کو اُس کی مفارقت کا قلق ہو۔

لیکن بڑا فرق ہے کہ فرض اور واقعات میں۔ یہ بھی نصوح کے نفس کا مکر تھا کہ وہ اپنے تئیں دنیا سے بے تعلق اور اپنی زندگی کو بے ہمہ و باہمہ سمجھتا تھا۔ جب تک وہ دوسروں کو مرتا دیکھتا تھا اپنے تئیں مرنے پر دلیر پاتا تھا لیکن جب خود اپنے سر پر آن بنی تو سب سے زیادہ بودا نکلا۔ وہ اپنے تعلقات سے واقع میں اب تک بے خبر تھا۔ جب موت سامنے آموجود ہوئی اور چلنا ٹھہر گیا تو حقیقت کھلی کہ ادھر زن و فرزند کا فریفتہ ہے، اُدھر مال و متاع کا دل دادہ۔ اتنا بڑا تو سفر اس کو درپیش مگر بار علائق کی وجہ سے پہلے ہی قدم پر اس کے پانوں ہزار ہزار من کے ہو رہے تھے۔ ریل کی سیٹی بج چکی تھی مگر یہ ابھی اسٹیشن کے باہر اسباب کے سنبھالنے میں مصروف تھا۔ اگر اسی حالت میں کہ اس کی روح تعلقات دنیوی میں ڈانواڈول بھٹکتی ہوئی پھر رہی تھی، کہیں خدانخواستہ اس کی جان نکل جاتی تو بس دونوں جہان سے گیا گزرا ہوا تھا۔ خسر الدنیا والآخرۃ۔ ازیں سو راندہ وزاں سو درماندہ۔ مگر خدا نے بڑا ہی فضل کیا کہ ناامیدی نے اس کی ہمت بندھائی اور اپنے دل میں سوچا کہ چلنا تو اب ٹلتا نہیں پھر قلق سے فائدہ اور اضطراب سے حاصل۔ مرتا ہوں تو مردانہ وار کیوں نہ مروں، اور استقلال کے ساتھ جان کیوں نہ دوں۔ اس بات کا ذہن میں آنا تھا کہ دنیا کی تمام چیزوں پر ایک اداسی چھا گئی۔ اب جس چیز کو دیکھتا ہے ہیچ او بے وقعت نظر آتی ہے۔ یہ وہ وقت تھا کہ ڈاکٹر نے اُس کو دوا پلا کر تھا لٹوایا تھا۔ استغنا سے ایک اطمینان جو دل کو پہنچا اور ادھر علالت کے اشتداد کا تکان تھا ہی، اوپر سے پہنچی دوا جو بالخاصہ خواب آور تھی اور تیمارداروں کا ہجوم کم ہوا، لیٹا تو نیند کی ایک جھپکی سی آگئی۔

آنکھ کا بند ہونا تھا کہ نصوح ایک دوسری دنیا میں تھا۔ جو خیالات ابھی

تھوڑی دیر ہوئے اس کے پیش نظر تھے سب اس کے دماغ میں بھرے ہوئے تھے۔ اب متخیلہ نے ان کو اگلے پچھلے تصورات سے گڈمڈ کر کے ایک نئے پیرائے میں لا سامنے کھڑا کیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک بڑی عمدہ اور عالیشان عمارت ہے اور چونکہ نصوح خود بھی ڈپٹی مجسٹریٹ حاکم فوجداری رہ چکا تھا تو اس کو یہ تصور بندھا کہ گویا ہائی کورٹ کی کچہری ہے۔ لیکن حاکم کچہری کچھ اس طرح کا رعب دار ہے کہ باوجودیکہ ہزاروں لاکھوں آدمیوں کا اجتماع ہے مگر ہر شخص سکوت کے عالم میں ایسا دم بخود بیٹھا ہے کہ گویا کسی کے منھ میں زبان نہیں اور جو کوئی بضرورت بولتا اور بات بھی کرتا ہے تو اس قدر آہستہ کہ کانوں کان خبر نہ ہو۔ اتنی بڑی تو کچہری ہے مگر مختار اور وکیل کسی طرف دیکھنے میں نہیں آتے۔ کچہری کے عملے اس طرح کے کھڑے اور اپنے حاکم سے اتنا ڈرتے ہیں کہ کسی اہل عاملہ اور مقدمے والے کو اپنے پاس تک آنے کے روادار نہیں۔

غرض کیا مجال کہ کوئی اپنے بارے میں ناجائز پیروی کر کے یا روپے پیسے کا لالچ دکھا کر یا سعی سفارش بہم پہنچا کر کاربرآری کر سکے۔ اگرچہ حاکم کی ہیبت ادنیٰ، اعلیٰ سب پر چھائی ہوئی ہے مگر اس کی رحمدلی، منصف مزاجی، معاملہ فہمی، ہمہ دانی کا بھی ہر شخص معتقد ہے۔ اختیارات اس کے اس قدر وسیع ہیں کہ نہ اس کے فیصلے کی اپیل ہے نہ اس کے حکم کا مرافعہ۔ کام کرنے کا ایسا اچھا ڈھنگ ہے کہ کام روز کا روز صاف۔ کتنے ہی مقدمے پیشی میں کیوں نہ ہوں ممکن نہیں کہ تاریخ مقررہ پر فیصلے نہ ہو جائیں۔ پھر یہ نہیں کہ کسی مقدمے کو رواداری اور سرسری طور پر تجویز کر کے ٹال دیا جائے۔ نہیں جو حکم صادر کیا جاتا ہے ہر عذر کو رفع، ہر حجت کو قطع، خود مجرم کو قائل معقول کر کے اور گناہگار کے منھ سے اس کی خطا تسلیم کرانے کے بعد۔ غرض جو تجویز ہے موجہ، جو فیصلہ ہے مدلل، جو رائے ہے حتمی واذعانی، جو حکم ہے دودھ کا دودھ پانی کا پانی۔ گواہوں کے باب میں ایسی احتیاط ملحوظ ہے کہ صرف عادل ثقہ اور راست گو کی گواہی لی جاتی ہے اور وہ بھی ایسے کہ واقف الحال چشم دید بلکہ ملزم کے رفیق و ہمنشیں کہ اس کے راز دار اور معین و مددگار ہوں۔ پھر کیا دیکھتا ہے کہ ہر مجرم کو فرداً فرداً فرد قرارداد جرم کی ایک نقل دی گئی ہے کہ وہ اُس کو پڑھ رہا ہے اور جتنے الزام اس پر لگائے گئے ہیں سب کو سمجھتا اور اپنی برأت کے وجوہات کو سوچتا ہے۔ کچہری کا خیال نصوح کو حوالات کی طرف لے گیا تو دیکھا ہر شخص ایک علاحدہ جگہ میں نظر بند ہے۔ جو جیسا مجرم ہے اس کے مناسب حالت اس کو حوالات میں سختی یا سہولت کے ساتھ رکھا گیا ہے۔ حوالات کے برابر جیل خانہ ہے مگر بہت ہی بُرا ٹھکانا ہے، محنت کڑی، مشقت سخت۔ جو اس میں گرفتار ہیں سولی کے متمنی اور پھانسی کے خواستگار ہیں۔ نصوح یہ مقام ہولناک دیکھتے ہی الٹے پاؤں پھرا۔ باہر آیا تو پھر حوالاتیوں اور زیر تجویزوں میں تھا۔ ان لوگوں میں ہزارہا آدمی تو اجنبی تھے لیکن جابجا شہر اور محلے کے آدمی بھی نظر آتے تھے مگر وہ جو مر چکے تھے۔

نصوح کو یہ سب سامان دیکھ کر اسی خواب کی حالت میں ایک حیرت تھی کہ الٰہی یہ کون سا شہر ہے؟ کس کی کچہری ہے؟ یہ اتنے مجرم کہاں سے پکڑے ہوئے آئے ہیں اور میرے ہم وطنوں نے کیا جرم کیا ہے کہ ماخوذ ہیں اور یہ کیسے مرے تھے کہ میں ان کو یہاں جواب دہی میں دیکھتا ہوں۔ اسی حیرت میں لوگوں کو دیکھتا بھالتا چلا جاتا تھا کہ دور سے اس کو اپنے والد بزرگوار انھیں حوالاتیوں میں بیٹھے ہوئے نظر پڑے۔ پہلے تو سمجھا کہ نظر غلطی کرتی ہے مگر غور کیا تو پہچانا کہ نہیں واقع میں وہی ہیں۔ دوڑ کر قدموں پر گر پڑا اور کہنے لگا کہ ''یا حضرت ہم سب آپ کی مفارقت میں تباہ ہیں، آپ یہاں کیوں؟''

باپ: میں اپنے گناہوں کی جواب دہی میں ماخوذ ہوں۔ یہ مقام جو تم دیکھتے ہو دارالجزا ہے۔ خداوند تعالیٰ جل وعلیٰ شانہ اس محکمے کا حاکم ہے۔

بیٹا: یا حضرت آپ تو بڑے متقی، پرہیزگار، خداپرست، نیکوکار تھے۔ آپ پر اور گناہوں کا الزام۔

باپ: گناہ بھی ایک دو نہیں سیکڑوں ہزاروں۔ دیکھو یہ میرا نامۂ اعمال، کیسی رسوائی اور فضیحت سے بھرا ہوا ہے اور میں اُس کو دیکھ دیکھ کر سخت پریشان ہوں کہ کیا جواب دوں گا اور کون سی وجہ اپنی برأت کی پیش کروں گا۔ یہ وہ کاغذ تھا جو نصوح نے ہر شخص کے ہاتھ میں دیکھا تھا اور اُس کو دنیا کے خیالات کے مطابق فرد قرارداد جرم سمجھا تھا۔

باپ کا نامۂ اعمال دیکھا تو تھرّا اٹھا۔ شرک اور کفر اور نافرمانی، ناشکری اور بغاوت اور بے ایمانی، کبر و نخوت، دروغ و غیبت، طمع و حسد، مردم آزاری، نفاق و ریا، حبِ دنیا کوئی الزام نہ تھا کہ اُس میں نہ ہو۔ چونکہ نصوح کے دماغ میں خیالات دنیوی گونج رہے تھے، لگا باپ کے نامۂ اعمال میں تعزیرات ہند کا دفعہ اور ضمن ڈھونڈھنے۔ سو بجائے دفعات تعزیرات ہند کے قرآن کی سورتوں اور آیتوں کا حوالہ تھا۔ متعجب ہو کر باپ سے پوچھا کہ یا حضرت پھر کیا آپ تمام ان جرموں کے مرتکب ہوئے ہیں؟

باپ: سب کا

بیٹا: کیا آپ حضور حاکم اقرار کر چکے ہیں۔

باپ: انکار کی گنجائش ہی نہیں۔ میری مخالفت میں گواہی اتنی وافر ہے کہ اگر میں انکار بھی کروں تو پذیرا نہیں ہو سکتا۔

بیٹا: جناب وہ کون لوگ ہیں جو آپ کی مخالفت پر آمادہ ہیں۔

باپ: اول تو دو شخص کرام کاتبین اس بلا کے ہیں کہ میرا کوئی فعل ان سے مخفی نہیں۔ جتنی باتیں کہتے ہیں پتے کی اور کہتے کیا ہیں، میرا روزنامچۂ عمری لکھتے گئے ہیں۔ اب جو میں اس کو دیکھتا ہوں، حرف بحرف صحیح اور درست پاتا ہوں۔ دوسرے یہی میرے اعضا ہاتھ، پانوں، آنکھ، کان کوئی میرے کہنے کا نہیں۔ سب کے سب مجھ سے منحرف، سب کے

سب مجھ سے برگشتہ، میری مخالفت پر آمادہ، میری تذلیل پر کمربستہ ہورہے ہیں۔

بیٹا: آخر آپ کچھ اس کی وجہ بھی سمجھتے ہیں۔

باپ: میں ان کو غلطی سے اعوان وانصار، بھیدی اور رازدار سمجھتا تھا مگر واقع میں یہ سب جاسوس ایزدی تھے۔ انھوں نے وہ وہ سلوک میرے ساتھ کیے کہ تسمہ لگا نہیں رکھا۔

بیٹا: آپ کا حال کیا ہے؟

باپ: جب سے دنیا کو چھوڑا قبر کی حوالات میں ہوں۔ تنہائی سے جی گھبراتا ہے، انجام کار معلوم نہیں۔ شبانہ روز اسی اندیشے میں پڑا گھلتا ہوں۔ حوالات میں مجھ کو اس قدر ایذا ہے کہ بیان نہیں کرسکتا۔ مگر صبح وشام ہر روز آتے جاتے جیل خانے کے پاس سے ہو کر گزرنا ہوتا ہے۔ دوزخ وہی ہے۔ وہاں کی تکلیفات دیکھ کر اور سن کر ہوش اُڑے جاتے ہیں اور غنیمت معلوم ہوتا ہے کہ اے کاش ہمیشہ کے واسطے اسی حوالات میں رہنے کا حکم ہو جاتا۔

بیٹا: پھر ہنوز آپ کا مقدمہ پیش نہیں ہوا؟

باپ: خدا نہ کرے کہ پیش ہوا! جو دن حوالات میں گزرتا ہے، غنیمت ہے۔ اول اول جب میں حوالات میں آیا تو اعمال نامہ مجھ کو حوالے کر دیا گیا۔ پس اُسی کو دیکھا کرتا ہوں اور انجام کار سے ڈرا کرتا ہوں، نجات کی کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آتی۔

بیٹا: بھلا کسی طرح ہم لوگ آپ کی اس مصیبت میں کام آسکتے ہیں؟

باپ: اگر میرے لیے عاجزی اور خلوص کے ساتھ دعا کرو تو کیا عجیب ہے کہ مفید ہو۔ ابھی میرے ہم سایے میں ایک شخص کی رہائی ہوئی، اس پر بھی بہت سے الزام تھے مگر جہاں اللہ تعالیٰ میں کامل درجے کا انصاف ہے، رحم بھی پرلے ہی سرے کا ہے۔ اس شخص کے پس ماندوں نے اس کے واسطے بہت زاری کی تو پرسوں یا ترسوں اس کو بلا کر ارشاد فرمایا کہ تیرے افعال جیسے تھے، وہ اب تجھ پر مخفی نہیں رہے مگر ہمارے کئی بندے تیری معافی کے واسطے ہمارے حضور میں گڑگڑاتے ہیں اور وہ تیرے ہی زن وفرزند ہیں۔ ہم کو تیری یہی ایک بات بھلی معلوم ہوتی ہے کہ تو نے اپنے خاندان میں نیکی اور دینداری کا بیج بویا، جا ہم نے تیری خطا معاف کی۔ سچ کہنا تم لوگوں نے بھی کبھی میرے حق میں دعائے خیر کی ہے؟

بیٹا: جناب آپ کے انتقال کے بعد رونا پیٹنا تو بہت کچھ ہوا اور اب تک اس شدومد کے ساتھ ہوتا ہے کہ گویا آپ نے ابھی انتقال فرمایا ہے۔ اور یہ رونا تو ہم لوگوں کے دم کے ساتھ ہے۔ آپ کی عنایتیں، آپ کی شفقتیں جب تک جئیں گے، یاد کریں گے۔ رسم دنیا کے مطابق آپ کا کھانا بھی برادری میں تقسیم کر دیا ہے۔ لوگ شاید میرے منہ پر خوشامد سے کہتے ہوں مگر کہتے تھے کہ اس مہنگے سے میں باپ کا کھانا اچھا کیا۔ دعا کے بارے میں غلط بات کیوں کر عرض کروں اہتمام نہیں ہوا۔ آپ کے بعد ترکہ و میراث کے ایسے جھگڑے پڑ گئے کہ آج تک نہیں سلجھے مگر یہ تو فرمائیے کہ آپ تو صوم وصلوٰۃ کے بڑے پابند تھے۔ کیا اعمال و افعال کچھ بھی کام نہ آئے؟

باپ: کیوں نہیں، یہ انھیں اعمال کی بدولت ہے کہ تم مجھ کو اس حالت میں دیکھتے ہو ورنہ بہتیرے مجھ سے بھی زیادہ تکلیف میں ہیں۔ حوالات میں جیل خانے کی سی ایذا ہے مگر یہاں اعمال میں خلوص نیت شرط ہے۔ میں نے اپنے اعمال کو آکر دیکھا تو اکثر جیسے جھوٹے موتی، کھوٹے روپے، نمازیں بے حضور قلب اکارت گئیں اور روزے چونکہ پابندی رسم کے طور پر رکھنے کا اتفاق ہوتا تھا، خالی فاقے کے شمار میں درآئے۔

بیٹا: پھر اس دربار میں کچھ سعی سفارش کا دخل نہیں؟

باپ: استغفراللہ، کوئی کسی کی بات تو پوچھتا ہی نہیں، نفسی نفسی پڑی ہے۔ ہر شخص اپنی بلا میں مبتلا اور اپنی مصیبت میں گرفتار ہے، دوسرے کی نجات تو کوئی کیا کرائے گا پہلے آپ تو سرخرو ہولے۔

بیٹا: کیوں جناب معاذ اللہ! یہ شرک و کفر کا الزام آپ پر کیسا ہے؟ ہم لوگ تو خیر، سارا شہر آپ کے اتقا کا معتقد تھا۔ کیا آپ خدا کے قائل نہ تھے؟

باپ: قائل تو تھا مگر دل سے معتقد نہ تھا۔

بیٹا: جناب آپ کے تمام اعمال ظاہر سے مستنبط ہوتا تھا کہ آپ کو خدائے کریم کے ساتھ بڑی راسخ عقیدت ہے۔

باپ: وہ تمام عقیدت معلوم ہوا کہ اوپری دل سے تھی۔ جب اول اول میرا اظہار لیا گیا تو پہلا سوال مجھ سے یہی پوچھا گیا تھا کہ تیرا رب کون ہے؟ چونکہ مرتے وقت مجھ کو ایمان کی تلقین کی گئی تھی میں نے جواب دیا کہ اَللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ' تب اس پر جرح کیا گیا کہ بھلا جب تو دکھن کی نوکری سے برخاست ہو کر گھر آیا اور مدت تک خانہ نشین رہا اور جو کچھ تو نوکری پر سے کما کر لایا، سب صرف ہوگیا اور تو نان شبینہ کو محتاج ہو کر نوکری کی جستجو میں اِدھر اُدھر پھرتا تھا اور مضطر ہو کر ہم سے دعائیں مانگتا تھا مگر ہم تیرا صبر واستقلال آزمانے کے لیے تیرے دعا کو حیز التوا میں ڈالے ہوئے تھے اور ایک انگریز حاکم ضلع نے کہ وہ بھی مثل تیرے ہمارا بندہ تھا، ہمارے ایما سے تیری پرورش کا وعدہ کیا۔ مگر ہم نے تجھ پر اپنے ایما کو ظاہر نہیں ہونے دیا اور تو یہی سمجھا کہ وہ تیری ہی کوشش کا نتیجہ تھا۔ سچ بتا کہ تجھ کو اس انگریز کے وعدۂ زبانی کا زیادہ آسرا تھا یا ہماری تحریر: تمسک وَمَامِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ اِلَّا عَلَي اللّٰهِ رِزْقُهَا(1)

کا۔ اگر تو ہم کو صمیم قلب سے حاضر و ناظر، سمیع و بصیر و قادر جانتا تھا تو گناہ پر تجھ کو کیوں کر جسارت ہوتی تھی۔ تو بھول کر بھی بھاڑ میں تو نہیں کودا، کبھی کھولتے پانی میں تو تو نے ہاتھ نہیں ڈالا، کبھی جلتی ہوئی آگ کو تو نے مٹھی میں نہیں لے لیا مگر تو گناہوں کا نہایت بیباکی سے مرتکب ہوتا تھا۔ ضروری ہے کہ یا تو تجھ کو یقین نہ تھا کہ گناہ کی سزا آتش دوزخ ہے یا اگر یقین تھا تو تو اس کو دنیا کی آگ سے کمتر سمجھتا تھا۔ دنیا میں جو کچھ رفاہ جو کچھ عیش و آرام ہم نے تجھ کو بے استحقاق صرف اپنی مہربانی سے عطا کیا تھا، کیا تو نے اس کو ہمیشہ اپنی حسن تدبیر کی طرف منسوب نہیں کیا؟ جو تکلیف تجھ کو دنیا میں پہنچی اگر چہ تو اپنے ہی ہاتھ سے اپنے پاؤں میں کلہاڑی مارا کرتا تھا مگر کیا تو اس کا الزام ہماری ذات مجمع الصفات پر نہیں لگاتا تھا۔ اے احسان فراموش! ہزاروں لاکھوں احسان میں نے تجھ پر کیے اور تجھ سے اتنا نہ ہوسکا کہ بھلا منہ سے اقرار تو کرتا۔ اے ناشکر! بیشمار نعمتیں میں نے تجھ کو عطا فرمائیں مگر تجھ پر اتنا بھی اثر نہ ہوا کہ کبھی زبان پر تو لاتا۔ جتنا میں نے تیرے ساتھ سلوک کیا، اتنا ہی تو میری مخالفت پر کمربستہ رہا، جتنی میں تیری رعایت کرتا رہا اسی قدر تو گستاخ اور شریر ہوتا گیا۔ اس حیات بے ثبات پر تجھ کو اتنا گھمنڈ ہو گیا تھا کہ تو اپنے تئیں ہماری خدائی سے باہر لے چلا تھا۔ اس چندروزہ زندگی پر تو اس قدر مغرور تھا کہ دائرہ عبودیت سے اپنے تئیں خارج کرنا چاہتا تھا ہم نے تجھ کو نیست سے ہست کیا اور خلعت انسانیت سے تجھ کو سرفراز بنایا۔ جو تجھ کو درکار تھا سو دیا۔ جس کا تو حاجتمند تھا سب مہیا کیا۔ ہر حال میں تیرے حافظ، ہر کیفیت میں تیرے نگہبان رہے۔ کیا اسی واسطے کہ تو کبھی بھول کر بھی ہماری طرف توجہ نہ کرے اور ہمیشہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد ہم سے جدا رکھے۔ جب تو ایک مضغۂ گوشت تھا، ضعیف و لاعقل، نادان و جاہل، ضعیف اتنا کہ نقل و حرکت پر قادر نہیں، نادان ایسا کہ خویش و بیگانے کا امتیاز نہیں، ہم نے تجھ کو دودھ پلوا پلوا کر توانا کیا اور اپنے بندے جو تجھ پر ہر طرح کا شرف رکھتے تھے یعنی تیرے ماں باپ تیری خدمت گزاری کو مقرر کیے اور ان کے دلوں میں تیری محبت ڈال دی کہ انھوں نے ہمارے حکم سے تجھ کو پالا پوسا اور تو روز بروز چونچال اور خوشحال ہوتا گیا۔ پھر ہم نے عقل کو تیرا اصلاح کار بنایا کہ تو اس کی مدد سے اپنی آسائش جائز کے واسطے ہر طرح کا سامان بہم پہنچائے۔ دنیا کے چرند پرند، حیوانات، نباتات، جمادات سب کو تیرا مطیع فرمان بنا دیا کہ تو اُن پر حکمرانی کرے اور ان میں متصرف رہے۔ کیا اس لیے کہ تو بہک کر بھی کبھی ہماری طرف رُخ نہ کرے اور سدا ہم سے بھاگا بھاگا پھرے۔ تیری زندگی محض ایک ہستی بے بود تھی۔ دو لمحے تجھ کو تنفس کے لیے ہوا نہ ملتی تو تیرا دم نکل جاتا۔ ایک رات دن بے آب و دانہ تجھ کو جینا دشوار ہوتا۔ منوں ہوا تو سونگھ گیا اور کبھی نہ سوچا کہ ہمارے طفیل سے غلّہ انبار کے انبار ٹھونس گیا اور کبھی نہ سمجھا کہ ہماری بدولت زندگی بھر کئی کنویں تو نے خالی کیے ہوں گے، مگر کبھی دھیان نہ کیا کہ ہمارے صدقے میں اور ایک پانی اور ہوا اور غلّہ و غذا کیا، ضرورت کی کُل چیزیں تو کہاں سے لاتا اور کہاں سے بہم پہنچاتا تھا؟ ہمارے توشہ خانہ عام سے۔ مگر اس پر تیری یہ ہیکڑی تھی کہ گویا ہم تیرے قرض دار ہیں یا ہم پر کچھ تیرا اُدھار آتا ہے۔ تو کھاتا تھا اور مکرتا تھا، لیتا تھا اور بھول بھول جاتا تھا۔ دنیا کی باتوں میں تو تیری عقل بڑی رسا تھی مگر تو جان بوجھ کر ہمارے ہی ساتھ تجاہل کرتا تھا۔ منھ پر آنکھیں تھیں اور اندھا، ایک چھوڑ دو دو کان تھے اور بہرا۔ زمین، آسمان، چاند، سورج، ستارے، جنگل، دریا، میدان، انواع و اقسام کے درخت، پھل پھول کھانے کو الوان نعمت، پہننے کو رنگا رنگ خلعت، جواہر بیش بہا نقرہ و طلا، دنیا بھر کا سامان ہم نے تیرے واسطے مہیا کیا اور ایک تیرے دم کے لیے اس قدر لوازمہ بہم پہنچایا۔ ہم کو یہاں تک تیری خاطر عزیز اور تو ہم سے منحرف، ہم کو اس قدر تیری بزرگداشت ملحوظ اور تو ہم سے برگشتہ۔ ہم چاہتے تو ایک ادنیٰ سی چیونٹی تیرے ہلاک کرنے کو کافی تھی۔ ہم حفاظت نہ کرتے تو خود تیرے جسم میں فساد کا مادہ ایسا تھا کہ ایک ذرا سا روگ تیرے فنا کر دینے کو بہت تھا مگر ہم تجھ سے دوستی کرتے تھے اور تو ہم سے عداوت، ہم عنایت کرتے تھے اور تو بغاوت۔ کیا یہی تھا بدلہ جو تو نے ہم کو دیا؟ کیا یہی تھا صلہ جو تجھ سے ہم کو ملا؟ ہم نے تجھ کو دنیا میں بھیجتے وقت کیا تاکید کی تھی کہ دیکھ روح یہ ایک جوہر لطیف ہے اور مجھ کو بہت ہی عزیز ہے، ایسا نہ کرنا کہ اس کو دنیا میں جا کر بگاڑ لائے۔ یہ میری عمدہ امانت اور نفیس ودیعت ہے۔ دیکھ اس کی احتیاط کما ینبغی اور حفاظت کما حقہ کیجیو۔ جیسا اجلا شفاف، براق روشن یہاں سے لے جاتا ہے ویسا ہی دیکھ لوں گا۔ آج تو اے روسیاہ! اُس کو لایا ہے مگر پوتھ سے بدتر اور ٹھیکری سے کمتر بنا کر نجس، ناپاک، تیرہ و بے آب، بدرونق، خراب۔ ہم نے تو تجھ سے چلتے چلتے کہہ دیا تھا کہ تو دنیا میں دل مت لگائیو اور اس طرح رہیو جیسے سرائے میں مسافر۔ تو وہاں گیا تو بس وہیں کا ہو رہا اور ایسی لمبی تان کر سویا کہ قبر میں آ کر جاگا۔ تھا تو مسافر اور بن بیٹھا مقیم، تھا تو سیاح اور ہو گیا متوطن۔ کیا تو تمام عمر دنیا میں مال نہیں جمع کرتا رہا اور کیا تو نے پکی پکی عمارتیں اس خیال سے نہیں بنوائیں کہ مدتوں ان میں رہے گا؟ مسافر کا یہی کام ہے، سیاح کا یہی شیوہ ہے۔ تو تو جانتا تھا کہ تجھ کو یہاں لوٹ کر آنا ہے پھر مرنے کے نام سے تجھ کو موت کیوں آتی تھی اور چلنے کی خبر سن کر تو مچلتا کیوں تھا؟

اوّل تو مجھ کو ہماری عبادت کا اتفاق ہی نہیں ہوا لیکن جب کبھی تو لوگوں کے شرم حضور یا دکھاوے یا اتباع رسم کی وجہ سے مصروف عبادت بھی ہوا تو کس طرح کہ دل کہیں تھا اور تو کہیں۔ کوئی نماز بھی تیری سجدۂ سہو سے خالی تھی؟ دنیا کی برسوں کی بھولی بسری باتیں تجھ کو نماز میں یاد آتی تھیں اور نماز تو کیا پڑھتا تھا گھاس کاٹتا تھا؟ نہ تعدیل ارکان ٹھیک، نہ قومہ درست، نہ قعدہ صحیح۔ برس بھر تو دوزخ شکم کو اناپ شناپ بھرتا رہتا تھا۔ برسویں دن صرف ایک مہینے کے روزے رکھنے کا ہم نے تجھ کو حکم دیا تا کہ تجھ کو ہماری نعمتوں کی قدر ہو، تجھ کو اپنے ابنائے جنس پر جو مبتلائے مصیبت ہیں، رحم آئے اور تیری صحت بدنی کو بھی نفع پہنچے۔ تیرے مزاج میں فروتنی اور انکسار کی صفت محمود کہ یہ ادا ہم کو بہت بھاتی ہے، پیدا ہو۔ لیکن یوں دنیا کے کام دھندے میں تو تو دن دن بھر بے آب و دانہ مصروف رہا۔ نہ شکوہ نہ گلہ، تازہ دم، ہشاش بشاش پھر کھانا تھورنے کو موجود مگر روزہ چونکہ ہمارے حکم سے تھا دن میں سیکڑوں مرتبہ تو پیاس کی شکایت اور جو آیا اس سے ضعف و ناتوانی کی حکایت، العطش اور الجوع، یہی تیرے دو وظیفے تھے۔ روزہ افطار کیا اور تو بدحواس ہو کر چارپائی پر ایسا گرا کہ گویا جان نہیں۔ باوجودیکہ تو دو دو دن کا کھانا ایک رات میں کھا لیتا تھا پھر بھی اسی تصور سے کہ کل پھر روزہ رکھنا ہے، تیری جوع البقر کو کسی چیز سے سیری نہیں ہوتی تھی۔ تو عید کا اس طرح منتظر رہتا تھا جیسے کوئی قیدی تاریخ رہائی کا۔ تیرا بس چلتا تو 29 کیا 19 کو عید کرتا۔ کیا ایسے ہی روزوں کے ثواب کا تو امیدوار اور اجر کا تو متوقع ہے۔

میں نے تجھ کو انسان بنا کر بھیجا تھا کہ مصیبت زدوں کی ہمدردی کرتے مگر تو نے ایسی تن آسانی اختیار کی کہ راحت پہنچانا تو درکنار دوسروں کو تکلیف دے کر بھی اپنی آسائش حاصل کرنے میں تجھ کو باک نہ تھا۔ تیرے ہمسائے، ہمارے بندے، رات کو فاقے سے سوتے تھے اور تجھ کو سوءِ ہضم کے علاج سے ان کی پرداخت کی پرواہ نہ تھی۔ تیرے پڑوس میں ایسے لوگ بھی تھے کہ جاڑے کی لمبی راتیں آگ تاپ تاپ کر سحر کرتے اور تو دوہرے دوہرے لحاف اور بھاری بھاری توشکوں میں چین سے پاؤں پھیلا کر سوتا۔ نعمت مال و دولت جو ہم نے تجھ کو عطا کی تھی تو نے تکلفات لایعنی اور نمود نمائش کی غیر ضروری چیزوں میں بہت کچھ تلف کی اور جو لوگ اس کے سخت حاجت مند تھے ترستے کے ترستے رہ گئے۔ تیری سب خباثتیں مجھ کو معلوم ہیں۔ تو نے درماندگی کا نام خدا رکھ چھوڑا تھا۔ جب تک سعی و تدبیر سے تجھ کو کار برآری کی امید ہوتی تھی تجھ کو ہرگز پروا نہیں ہوتی تھی کہ خدا بھی کوئی چیز ہے اور انتظام دنیا میں اس کو بھی کچھ دخل ہے مگر جب تو عاجز اور درماندہ ہوتا تھا جب تو خدا کو یاد کرتا تھا۔

اگر ہماری خدائی اور سلطنت تیری فرمانبرداری کی محتاج ہوتی تو تو نے اس کے اٹھا دینے میں کچھ کوتاہی نہیں کی۔ تو نے ہمارے فرمان واجب الاذعان کی بے حرمتی اور احکام لازم الاحترام کی بے توقیری کی اور تو نے اپنا بُرا نمونہ دکھا کر میرے دوسرے بندوں یعنی اپنے فرزندوں کو بھی گمراہ کیا۔

ہر روز تو لوگوں کو مرتے دیکھتا اور سنتا تھا، کیا تجھ کو نہیں سمجھنا چاہیے تھا کہ ایک دن تو بھی مرے گا؟ خود تیری حالت میں کتنے کتنے انقلاب واقع ہوئے۔ لڑکے سے جوان ہوا، جوان سے بڈھا، ناتواں۔ بال تیرے سفید ہوئے، دانت تیرے ٹوٹے، کمر تیری جھکی، قوتوں میں تیری فتور آیا۔ غرض ہم نے تجھ کو سوتا دیکھ کر بہتیرا جھنجھوڑا، بہتیرے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دیے، کئی بار اٹھا اٹھا کر بٹھا بٹھا دیا مگر تیرے نصیب پتھا ایسے سوتے تھے کہ تو نے کروٹ تک نہ لی۔

تمامی عمر تو غفلت میں سویا
ہمارا کیا گیا کچھ اپنا کھویا

سخت گیری خود ہماری عادت نہیں اور سخت گیری ہم کریں بھی تو کس پر؟ اپنے بندوں پر جن کا مارنا اور جلانا ہر وقت ہمارے اختیار میں ہے۔ مگر جب بندہ بندہ ہو اور ہم کو اپنا مالک سمجھے نا۔ خرنا مشخص کہ ہم تو دیں نور اور وہ کہے کہ میری آنکھیں پھوٹیں۔ ہم سے زیادہ بھی کوئی درگزر کرنے والا ہوگا کہ ایک معذرت پر عمر بھر کے گناہوں کو ہم نے قاطبۃً کھلا کھلا دیا ہے لیکن توبہ و استغفار، ندامت و حسرت کا اظہار بھی تو کوئی کرے۔ ہماری رحمت حیلہ جو ہماری رافت بہانہ طلب کتنی کتنی بار جوش میں آئی مگر ہم نے اس کو صرف کرنے کا موقع نہ پایا۔ اگر بندہ ہمارے ساتھ نسبت عبودیت صحیح رکھتا تو ہم اس کی لاکھ برائیوں پر خاک ڈالتے۔ ہم کو تو بڑی شکایت یہی ہے کہ اس نے ہم کو معبود ہی نہ گردانا، عالم اسباب میں رہ کر اسباب پرست ہو گیا۔ پھر ہم جو دیکھتے ہیں تو ہمارے احکام بھی کچھ سخت نہ تھے۔ کھانے کو ہم نے نہیں روکا، سونے کو ہم نے منع نہیں کیا، تمتعات دنیوی سے باز نہیں رکھا۔ پھر جو تو نے ان کی بجا آوری نہ کی تو سوائے تیری بدنفسی کے اور تو کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ اے شخص، نجات جس کا تو اب نہایت آرزومندی کے ساتھ خواہاں ہے، اے کاش! زندگی میں تجھ کو اس کی اتنی بھی پروا ہوتی جیسے اُرد پر سفیدی۔ دنیا کے چھوٹے چھوٹے نقصان اور ذرا ذرا سے زیاں تجھ کو مضطر اور بے چین کر دیا کرتے تھے اگرچہ کیا دنیا اور کیا دنیا کا خسارہ؟ کیا پدی اور کیا پدی کا شوربا۔ لیکن تباہی دین کی تجھ کو خبر تک بھی تو نہیں ہوئی۔ اے کاش! تجھ کو نماز کے قضا ہونے کا اتنا ہی رنج ہوتا جتنا کہ ایک مٹی کے پرانے آبخورے کے ٹوٹ جانے کا ہوتا تھا۔ ہم جانتے ہیں کہ اب تجھ کو بہت ہی بڑی ندامت ہے لیکن اس ندامت کا کچھ ماحصل نہیں اس واسطے کہ یہ دارالجزا ہے دارالعمل نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ تو ایک بات کا جواب بھی نہیں دے سکتا لیکن حجت تمام کرنے کی نظر سے ہم تجھ کو مہلت دیتے ہیں۔ جا اپنے نامۂ اعمال کو دیکھ اور اچھی طرح سوچ سمجھ کر کوئی بات ہم سے بیان کر بشرطیکہ معقول اور قابلِ قبول ہو۔

□□□

اسد رضا

انگلینڈ کا سفر بھی رہا باعث ظفر

جب تک ہم انگریزی کے لیکچرر رہے تب تک کسی انگریز نے ہمیں انگلینڈ کا سفر کرنے کی دعوت نہیں دی لیکن جیسے ہی ہم کالج کی ملازمت چھوڑ کر اردو کے ادیب، صحافی، شاعر اور طنز و مزاح نگار وغیرہ بنے نیز ہماری چند اردو کتابیں منظر عام پر آئیں، ویسے ہی برمنگھم میں منعقد ہونے والے اردو فیسٹول میں شرکت کرنے کا دعوت نامہ موصول ہوگیا۔ مدعو کرنے والی شخصیت بھی کوئی اور نہیں بلکہ یوروپ میں اردو کے چراغ روشن کرنے والے ادیب وشاعر سید عاشور کاظمی تھے۔ بہرحال ہم نے برطانوی ہائی کمیشن میں ویزا کے لیے درخواست دی۔ چونکہ ہم پہلی بار برطانیہ جارہے تھے اور اتفاق سے مسلمان بھی تھے لہٰذا ویزا دینے میں تامل کیا گیا۔ ہم نے انگریز ذمہ داروں کو اردو فیسٹول کا دعوت نامہ دکھایا اور عرض کیا کہ ''اردو کا ادیب وشاعر معشوق کی نظر کے تیر اور ابرو کی کٹار سے عموماً زخمی تو ہوجاتا ہے لیکن کسی کو دہشت گرد بن کر زخمی نہیں کرتا''۔ ہماری اس دلیل سے ویزا افسر مطمئن ہوگیا اور ویزا دے دیا۔ ترکمانستان ایئرلائنز کے طیارے سے ہمیں برمنگھم پہنچنا تھا۔ انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم ہمارے ہم سفر تھے۔ ترکمانستان کے شہر عشق آباد کے ایئرپورٹ سے چونکہ ہمیں دوسرے ہوائی جہاز کے ذریعے برمنگھم جانا تھا لہٰذا چند گھنٹے اس شہر کے ہوائی اڈے پر بھی گزارے۔ ایئرپورٹ کے ایک کمرے میں نماز کے لیے گوشہ دیکھ کر جہاں خوشی ہوئی وہیں شیشے کی خنجر وتلوار نما بوتلوں میں بھری ہوئی شراب نے حیرت زدہ بھی کیا۔ ترکمانستان کی راجدھانی سے پرواز کرنے کے بعد شام کے دھندلکے میں ہمارا طیارہ برمنگھم کے ہوائی اڈے پر اترا۔ عاشور صاحب بہ نفس نفیس ہوائی اڈے پر ہمیں لینے آئے تھے، محبت سے بغل گیر ہوئے، پھولوں کی طرح مہکتے ہوئے خلوص اور چاند کی طرح چمکتی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ انھوں نے ہم دونوں کا خیر مقدم کیا۔ برمنگھم کی فضا ابرآلود تھی اور ہلکی ہلکی بارش ہورہی تھی۔ دہلی کے مقابلے میں سردی بھی زیادہ تھی۔ ایک پرفضا اور سرسبز وشاداب اپارٹمنٹ میں واقع عاشور کاظمی کی رہائش گاہ پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ امریکہ اور کناڈا سے تشریف لائے کچھ ادیب وشاعر مثلاً باقر زیدی، اطہر رضوی، افتخار نسیم وغیرہ وہاں پہلے سے موجود ہیں۔ دریں اثنا پٹنہ سے پروفیسر وہاب اشرفی اور پروفیسر اعجاز علی ارشد بھی آگئے۔ جہاں ایک درجن سے زائد ادیب وشاعر جمع ہوجائیں وہاں اردو کے مستقبل پر بات چیت اور گرما گرم ادبی بحث نہ ہو یہ ممکن ہی نہیں۔ لہٰذا مجبوری ادب پراتنے زور شور سے بحث شروع ہوئی کہ صاحب خانہ کو دست بستہ یہ درخواست کرنا پڑی کہ مہمانان کرام انگلینڈ کے قوانین اور ہمسایوں کی نیند کا لحاظ رکھیں کیونکہ انگریزی قوانین کے مطابق اپنے گھر میں شور کرنا یا زور سے بولنا بھی ایک جرم ہے اور پولس مجرم کو گرفتار بھی کرسکتی ہے۔ اس تنبیہ نما درخواست کو سن کر فلک شگاف قہقہے اور چھت شکن بحثیں کسی قدر ہلکی پڑیں۔ دریں اثنا ڈاکٹر شبانہ نے جو برمنگھم میں درس وتدریس اور الیکٹرانک میڈیا سے وابستہ ہیں، گرم چائے پیش کی اور ہم لوگوں سے ملاقات کے لیے تشریف لائے مقامی اردو والوں سے دلچسپ انداز میں تعارف بھی کرایا۔ چونکہ شب میں سردی بڑھنے لگی تھی اور ہم سب تھکے ہوئے بھی تھے لہٰذا چند منٹ بعد اپنے اپنے کمروں میں آرام کرنے چلے گئے۔ ہمیں یہ دیکھ کر انتہائی مسرت ہوئی کہ عاشور صاحب کے دولت کدے پر انگریزوں کی پسندیدہ کالی نہیں بلکہ ہم ہندوستانیوں کو مرغوب گوری چائے پیش کی گئی تھی، دراصل ہم لوگ دودھ آمیز چائے کو گوری چائے ہی کہتے ہیں۔ عشائیہ بھی برصغیر ہندوپاک کے کھانوں سے آراستہ تھا۔

انسٹی ٹیوٹ آف تھرڈ ورلڈ آرٹس اینڈ لٹریچر برمنگھم کی جانب سے اگلے روز صبح دس بجے ایک شاندار ہال میں یوروپ وانگلینڈ میں اردو تعلیم کے سلسلے میں سیمینار کا انعقاد ہوا جس میں خود میزبان اور انسٹی ٹیوٹ کے جنرل سکریٹری سید عاشور کاظمی نے برطانیہ میں اردو تعلیم کی صورت حال اور درپیش مسائل پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ بعض مقالہ نگاروں نے اردو تعلیم سے متعلق اپنے مقالات انگریزی زبان میں پڑھے۔ مقالات پر بحثیں بھی ہوئیں۔ جو اتنی گرم نہیں تھیں کہ ان کی گرمی میں اردو تعلیم کی ترقی سے متعلق منصوبے پگھل جائیں۔ ہمیں اس سیمینار میں ہی یہ خوشگوار علم بھی ہوا کہ برمنگھم میونسپل کارپوریشن کے میئر ایک اردو والے خالد خاں صاحب بھی رہ چکے ہیں اور یہ کہ اس شہر کے کچھ اسکولوں میں اردو بطور اختیاری مضمون پڑھائی بھی جاتی ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ مسرت انگیز بات یہ تھی کہ برمنگھم میں ایک اردو کا ایف ایم ریڈیو اسٹیشن بھی ہے جس سے اردو یا ہندوستانی کے پروگرام، نغمے اور مشاعرے وغیرہ نشر ہوتے رہتے ہیں۔ عاشور صاحب کی کار میں ہم نے اس ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہونے والے پروگرام سنے۔ اس اسٹیشن سے وہ مشاعرہ بھی نشر ہوا جو برطانیہ میں جشن اردو یا اردو فیسٹول کے سلسلے میں منعقد ہوا تھا اور جس میں احسان محسن، افتخار نسیم، باقر زیدی، پروفیسر اعجاز علی ارشد، باصر کاظمی اور راقم

الحروف کے علاوہ ہندوپاک اور یوروپ کے دیگر شعرا نے اپنے کلام سے سامعین کو نوازا تھا۔ اگرچہ منتظمین نے ہمیں اپنی ڈھلتی عمر کا احساس کرانے کے لیے مجلس صدارت میں شامل کردیا تھا تاہم یہ دیکھ کر ہمیں خوشی ہوئی کہ مشاعرے میں گلے باز شعرا کو پسند نہیں کیا گیا۔ البتہ تحت میں پڑھے گئے اچھے اشعار کو داد وتحسین سے نوازا گیا۔ اپنے وطن کی طرح اردو شعرا میں وہاں بھی گروپ بندی کا احساس ضرور ہوا۔

اردو فیسٹول کے دوسرے دن مرثیے پر سیمینار کا انعقاد ہوا جس میں کناڈا سے تشریف لائے ڈاکٹر اطہر رضوی، ڈاکٹر تقی عابدی، امریکہ سے آئے معروف مرثیہ گو باقر زیدی وغیرہ نے مقالات پیش کیے اور تقاریر بھی کیں۔ مولانا شبلی نعمانی کا ''موازنۂ انیس ودبیر'' شدید بحث کا موضوع رہا۔ کچھ حضرات بالخصوص ڈاکٹر تقی عابدی نے تو اس موازنے کو مرثیے کے خلاف سازش قرار دیتے ہوئے مولانا شبلی پر جانب داری کا الزام تک لگایا، لیکن رثائی ادب کے ماہر اور سیمینار کے بانی سید عاشور کاظمی نے اپنی متوازن تقریر سے ماحول کو تلخ نہیں ہونے دیا۔ مگر اس سیمینار سے ہم جیسے انیس پرستوں کو یہ سبق ضرور ملا کہ مرزا دبیر بھی ایک عظیم مرثیہ گو تھے لہٰذا دونوں عظیم مرثیہ گو قابل قدر ہیں۔ سیمینار کے اختتام کے بعد ہم لوگ برمنگھم کے ایک ایسے مال میں گئے جہاں ہر چیز کی قیمت صرف ایک پونڈ تھی۔ چونکہ ہمارے رفقا میں بیشتر کا تعلق ہندوپاک سے تھا لہٰذا ہم سب نے ایک پونڈ کو روپیوں میں تبدیل کیا۔ ایک پونڈ کی قیمت تقریباً 85 ہندوستانی روپے تھی۔ تاہم کچھ چیزیں مثلاً چشموں کے فریم، ٹافیوں کے پیکٹ اور سینٹ کی شیشیاں وغیرہ 85 روپے میں مہنگی نہیں تھیں۔ پروفیسر مظفر حنفی کے فرزند ارجمند پرویز مظفر حنفی میاں نے ہمیں برمنگھم شہر کی سیر کرائی، صاف ستھری سڑکوں اور بازاروں میں گھمایا، ایک ایسے ہوٹل میں کھانا بھی کھلوایا جس میں آپ اپنی کار سمیت ایک کھڑکی کے پاس پہنچیے، کھانے کا آرڈر دیجیے اور پھر کار میں بیٹھ کر ہی کھانا کھائیے۔ اگرچہ کھانا ہندوستانی تھا لیکن کھانے کا انداز انگریزی تھا۔

برمنگھم کے چند اسکولوں میں اردو ایک اختیاری مضمون کے طور پر پڑھائی جاتی ہے۔ ہم نائٹ نامی اسکول میں گئے جہاں طلبہ وطالبات کو جدید ترین ٹکنالوجی مثلاً کمپیوٹر وغیرہ کا استعمال کرتے ہوئے تعلیم دی جاتی ہے۔ اس اسکول کی وائس پرنسپل ایک پاکستانی خاتون ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ایک سو سے زائد بچے یہاں اردو کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ڈاکٹر شبانہ کاظمی بھی اسی اسکول میں ٹیچر ہیں۔ اردو کے علاوہ اس اسکول میں عربی اور ہندی کی بھی تعلیم دی جاتی ہے۔ انگلینڈ میں تمام شہریوں کے لیے تعلیم لازمی ہے۔ اسی لیے وہاں ناخواندہ شہری ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے۔ اس ملک کی ترقی کا ایک سبب مجھے یہ بھی محسوس ہوا کہ وہاں تعلیم یافتہ لوگ بولتے کم اور کام زیادہ کرتے ہیں، جبکہ ہمارے ہاں صورتحال برعکس ہے، عوام تا خواص کام کم اور کلام زیادہ کرتے ہیں۔ برمنگھم سے اگلے روز ہم لندن کے لیے روانہ ہوئے۔ کاروں کا ایک قافلہ تھا جس میں ہندوستان، پاکستان، ہالینڈ، کناڈا، امریکہ، انگلینڈ وغیرہ کے اردو مشاہیر موجود تھے۔ ہائی وے پر کہیں کوئی گڈھا نہیں ملا، حالانکہ انگلینڈ میں اکثر بارش ہوتی رہتی ہے لیکن سڑک پر کہیں بھی ہمیں پانی سے بھری ہوئی کوئی جگہ نہیں ملی۔ ہمیں تو چونکہ گڈھوں سے آراستہ اور جگہ جگہ جمع ہوئے پانی کی حامل سڑکوں کی عادت ہے لہٰذا لندن برمنگھم ہائی وے پر دوڑتے ہوئے کوئی خاص مزہ نہیں آیا۔ جب تک گڈھوں کی وجہ سے کار میں جھٹکے نہ لگیں اور کوئی گلاب کی ڈالی سینے سے نہ آلگے تب تک سفر حسین ورنگین نہیں ہوتا۔ اگرچہ راستے میں دیہات بھی پڑے لیکن ہر گاؤں کو ہائی وے سے صرف فلائی اوور کے ذریعے ہی جوڑا گیا تھا۔ لہٰذا حادثات کے امکان بہت کم نظر آئے۔ چونکہ ہم انگلینڈ پہلی مرتبہ آئے تھے لہٰذا لندن دیکھنے کا اشتیاق تھا۔ یوں بھی انگریزی ادب کو پڑھتے اور پڑھاتے ہوئے لندن سے علمی وادبی تعلق بہت زیادہ تھا۔ ہم نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر شیکسپیئر، تھامس ہارڈی اور ورڈس ورتھ کے شہر کو دیکھا۔ صاف ستھری، سرسبز وشاداب درختوں اور رنگ برنگے پھولوں سے آراستہ چوڑی چوڑی سڑکیں اور ان کے دونوں جانب یوروپی فن تعمیر کے نمونے پیش کرتی عمارتیں بہت اچھی لگیں۔

لندن کے جام: اگر آپ سوچ رہے ہیں کہ ہم یہاں لندن کے میخانوں میں چھلکنے والے جاموں کا ذکر کرنا چاہتے ہیں تو غلط سوچ رہے ہیں۔ دراصل ہم تو لندن کی سڑکوں پر ٹریفک کی وجہ سے لگنے والے جام کا ذکر کررہے ہیں۔ لیکن لندن کی سڑکوں پر لگنے والے جام اتنے دور تک اور دیر تک نہیں لگتے جتنے ہماری راجدھانی دہلی میں لگتے ہیں۔ بہر حال ٹریفک جام سے نکل کر ہم لندن کی ایک امام بارگاہ میں پہنچے جہاں مرثیہ خوانی کی ایک محفل منعقد ہوئی۔ کثیر منزلہ امام بارگاہ پوری طرح کمپیوٹرائزڈ تھی اور اس کی دوسری منزل پر ایک شاندار کتب خانہ بھی تھا جس میں ہر قسم کی مذہبی وادبی کتب موجود تھیں۔ عمارت کے بیس مینٹ میں جلسہ گاہ تھی جہاں محافل ومجالس کا انعقاد ہوتا ہے۔ بھرت پور (ہندوستان) سے ہجرت کرکے پاکستان اور پاکستان سے ہجرت کرکے امریکہ میں آباد ہونے والے معروف مرثیہ گو شاعر جناب باقر زیدی اور دیگر شعرا نے مراثی اور منقبتی نظموں سے حاضرین کو نوازا۔ اسی امام بارگاہ میں میرے رشتے کے ماموں سید اجمل مہدی زیدی صاحب مجھے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے تشریف لے آئے۔ انھیں میری آمد کا پہلے ہی سے علم تھا، اجمل ماموں اپنی گاڑی سے مجھے سب سے پہلے سینٹرل لندن لے گئے۔ دریائے ٹیمز کی سیر

کرائی، بازاروں میں گھمایا، برطانوی پارلیمنٹ کو قریب سے دکھایا۔ لندن کا نظارہ کرتے کرتے رات ہوگئی تھی۔ سارا شہر روشنی کے سمندر میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہر طرف حسن تھا جوانی تھی، گورے چٹے انگریز جوڑے گھوم رہے تھے اور کھلم کھلا عشق کا اظہار کررہے تھے۔ ماموں صاحب کے سامنے ان مناظر کو دیکھ کر ہم بظاہر شرمارہے تھے لیکن دل ہی دل میں محظوظ بھی ہورہے تھے۔ لہٰذا ہم نے فیصلہ کیا کہ کل سے اجمل ماموں کے ساتھ نہیں بلکہ تنہا لندن گھومیں گے۔ دریں اثنا ہمیں بھوک بھی لگنے لگی تھی لہٰذا ماموں صاحب ہمیں ایک ایسے بازار میں لے گئے جہاں ہوٹل اور ریستوراں بڑی تعداد میں تھے۔ بعض ہوٹلوں کے نام پڑھ کر ہی ہمارے منہ میں پانی آگیا۔ مثلاً ایک ہوٹل کا نام ''چٹخارہ'' تھا تو دوسرے کا ''لاہوری کڑھائی'' اور تیسرے کا ''ذائقہ'' ظاہر ہے کہ ان سب میں برصغیر ہندوپاک کے کھانے ہی زیادہ ملتے ہیں۔ ایک ہوٹل میں ہم دونوں داخل ہوگئے۔ ڈائننگ ٹیبل کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے ہم نے ہوٹل میں محوِ خورد ونوش افراد پر ایک طائرانہ نظر ڈالی تو یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ شامی کباب، قورمہ، نہاری، پائے، مرغ بریانی، دوپیازہ، مٹر قیمہ، سیخ کباب، تندوری مرغ اور دیگر مغلیہ کھانے صرف برصغیر کے باشندے ہی نہیں بلکہ انگریز جوڑے بھی نوش فرمارہے تھے۔ کچھ انگریزوں کے گال تو تیز مرچ مسالوں کی وجہ سے مزید لال ہوگئے تھے، بعض کی آنکھوں اور ناک دونوں سے پانی بہہ رہا تھا شاید سرخ مرچ کے زیر اثر۔ ہم نے ہوٹل کا مینو پڑھنا شروع کیا لیکن یہ دیکھ کر ہمیں بہت حیرت ہوئی کہ مینو میں سادے پانی کی قیمتیں بھی لکھی تھیں جو خاصی تھیں۔ ہمارے استفسار پر اجمل ماموں نے بتایا کہ ہندوستانی ہوٹلوں کے برعکس یہاں ہوٹل یا ریستوراں میں مفت پانی نہیں دیا جاتا بلکہ عام پانی کی بھی خاص قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔

اگلے روز ہم نے لندن میٹرو میں سفر کیا اور دیکھا کہ انگریز مسافر کتابیں پڑھنے یا عشق کرنے میں تو معروف ہیں لیکن کسی کو کسی سے بات کرنے کی قطعی فرصت نہیں۔ دراصل وہاں لب بہ لب ہی باتیں ہوتی ہیں۔ میٹرو ٹرین اگرچہ پرانی تھی لیکن صاف ستھری تھی۔ انگلینڈ میں شاید صفائی پر زیادہ توجہ دینے کے باعث ہی ہمیں سڑکوں اور گلیوں میں ٹائلٹ (پیشاب گھر) نظر نہیں آئے۔ چونکہ ٹھنڈا ملک ہے لہٰذا ہم جیسے گرم ملک کے باشندوں کو حاجت خورد یعنی پیشاب کرنے کی ضرورت زیادہ پیش آتی ہے۔ 20 پنس یعنی تقریباً 17 ہندوستانی روپے باکس میں ڈال کر ہی آپ وہاں کسی ریستوراں کے ٹائلٹ میں داخل ہوسکتے ہیں۔ ہمیں لندن کی سیر کرتے ہوئے ایک دن میں پانچ بار ٹائلٹ جانا پڑا۔ اس طرح 85 روپے ہمیں صرف پیشاب کرنے کے لیے خرچ کرنا پڑے۔ ہمیں متنبہ کیا گیا کہ سڑکوں اور گلیوں میں تھوکنا، گندگی پھیلانا اور پیشاب کرنا قانونی جرم ہے جس پر سزا یا جرمانہ ہوسکتا ہے۔ شاید اسی سختی کی وجہ سے ہمیں انگلینڈ میں کہیں بھی مچھر یا مکھی کے درشن نہیں ہوئے۔ اسی طرح اس یوروپی ملک میں ہمیں جسمانی عریانیت کے ساتھ ساتھ اعلیٰ انسانی اقدار، اخلاق، نرم مزاجی، روشن خیالی، محنت اور محبت کی عظمت اور کم گوئی جیسی صفات بھی نظر آئیں۔

اگلے روز ہم بذریعہ بس لندن سے برمنگھم واپس آگئے۔ ہمیں یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ سرکاری بسوں میں ڈرائیور ہی کنڈکٹر کی خدمات انجام دیتا ہے۔ بس اسٹینڈ پر جناب عاشور کاظمی ہمیں لینے کے لیے خود تشریف لائے تھے۔ ڈاکٹر خلیق انجم پہلے ہی ایئرپورٹ پہنچ چکے تھے لہٰذا ہم بھی اپنے سامان کے ساتھ بس اسٹینڈ سے سیدھے ایئرپورٹ ہی پہنچ گئے۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ انگلینڈ میں ہمیں انگریزی میں بات چیت کرنے کی ضرورت بہت کم پیش آئی۔ گورے انگریزوں کے ہاتھوں کالی چائے پینے کا موقع بھی نہیں ملا۔ اگرچہ انگلینڈ میں ہم نے متعدد ہوش ربا اور ایمان شکن مناظر دیکھے لیکن اپنی اکلوتی بیوی کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ ہم وہاں سے بہ خیر وعافیت واپس آئے۔ بہ خیر وعافیت واپسی کی وجہ ہماری خاندانی شرافت اور ایمانی طاقت کم اور جیبی نقاہت زیادہ رہی۔ واقعی جیب کا کچا آدمی لنگوٹ کا پکا ہوتا ہے۔ بہرحال:

اچھے برے وہاں پہ ہوئے تجربے مگر
انگلینڈ کا سفر بھی رہا باعثِ ظفر

□□□

پتہ:
E-11/47, Hauz Rani,
Malviya Nagar,
New Delhi-110017

قومی اردو کونسل اور ماہ نامہ ''اردو دنیا'' اور سہ ماہی ''فکر و تحقیق'' سے خط و کتابت
بذریعہ ای میل اب اس پتے پر کریں۔
Email:urduduniyancpul@yahoo.co.in

فاروق ارگلی

جمنا داس اختر

جمنا داس اختر اردو کے اس عہد رفتہ کی جیتی جاگتی یادگار تھے جب اردو کی شاندار مشترکہ تہذیب کے چراغ پنجاب کی سرزمین پر آب و تاب کے ساتھ روشن تھے۔ جب پورے ہندوستان کی اردو صحافت کے ساتھ پنجاب کی اردو صحافت بھی آزادی کی جدوجہد کو آگے بڑھانے میں سرگرم تھی، جب اردو پنجاب کے مسلمانوں سے زیادہ ہندوؤں اور سکھوں کی اپنی زبان ہوا کرتی تھی۔ جمنا داس اختر اسی سنہرے ماضی کی یادگار تھے جس نے اردو زبان و ادب کو گنڈا سنگھ مشرقی، لبھو رام جوش ملسیانی، بالمکند عرش، تلوک چند محروم، کنور مہندر سنگھ بیدی، کرتار سنگھ دگل، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، گوپال متل، نریش کمار شاد، جگن ناتھ آزاد، بلراج کومل جیسے شاعر و ادیب مالک رام اور گوپی چند نارنگ جیسے محقق اور ناقد اور جمنا داس اختر جیسے ہمہ جہت قلمکار عطا کیے۔ اردو زبان اپنے ان پنجابی فرزندوں پر ہمیشہ ناز کرتی رہے گی۔

جمنا داس اختر کی پوری زندگی جہد مسلسل کی داستان ہے۔ ان کا جنم 2 نومبر 1916 کو راولپنڈی میں ہوا۔ ان کے والد بھگوان داس مہتہ شہر کے معززین میں شمار ہوتے تھے۔ ان کے خاندان کا تعلق بھائی متی داس کے گھرانے سے تھا۔ جمنا داس اختر کی تعلیم سناتن دھرم ہائی اسکول اور پھر ڈی اے وی کالج راولپنڈی میں ہوئی۔ بہت چھوٹی سی عمر سے ہی انھیں ادب اور لیاقت کا چسکا لگ گیا تھا۔ صرف پندرہ سال کی عمر میں یعنی 1931 میں وہ لاہور سے شائع ہونے والے روزنامہ ''بندے ماترم'' کے راولپنڈی کے نمائندے بن گئے۔ اس سے ان کی لکھنے کی غیر معمولی لگن اور خبر نویسی کے شوق کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ صرف ایک سال بعد 1932 میں وہ امرتسر کے اخبارات ''سناتم دھرم پرچارک'' اور ''ارجن'' کے معاون ایڈیٹر بن گئے۔ بہت سے لوگ اگر جمنا داس اختر کو پیدائشی صحافی کہتے تھے تو اس کی وجہ ان کا تیز رفتار صحافتی سفر ہی تھا۔ وہ 1933 میں ''بندے ماترم'' لاہور کے جوائنٹ ایڈیٹر بنے۔ 18 سال کی عمر میں انھیں اردو، ہندی اور انگریزی پر عبور حاصل ہو گیا تھا۔ وہ سیماب صفت نوجوان تھے۔ انھیں تیزی کے ساتھ اپنی منزل کی تلاش تھی۔ 1934 میں انھوں نے راولپنڈی سے اپنا ہفت روزہ ''پیشوا'' شروع کر دیا اس سے اطمینان نہ ہوا تو 1935 میں لاہور کے روزنامہ ''ویر بھارت'' لاہور کے نائب ایڈیٹر ہو گئے۔ دو سال بعد 1937 میں روزنامہ ''بھارت ماتا'' لاہور کے جوائنٹ ایڈیٹر مقرر ہوئے اور پھر 1939 میں روزنامہ ''ملاپ'' لاہور میں نائب مدیر کی ذمے داریاں سنبھالیں جو اس دور کا اہم ترین اخبار تھا۔ وہ ہندوستان کی تحریک آزادی کے نقطۂ عروج کا زمانہ تھا، اردو اخبارات خاص طور پر آزادی کی جدوجہد میں سرگرم کردار ادا کر رہے تھے۔ اس دور کے مقبول روزنامے کا نائب ایڈیٹر ہونا بہت بڑی بات تھی۔ کیونکہ اس عہدے پر کام کرنے والے صحافی غیر معمولی تحریری صلاحیت اور سیاست اور ملکی حالات سے مکمل آگہی کا حامل ہونا ضروری تھا۔ نوجوان جمنا داس اختر کے شعلہ بار قلم کی شہرت پورے پنجاب میں پھیل چکی تھی۔ 1943 میں جمنا داس اختر بیک وقت دو اہم اخبارات، روزنامہ ''ویر بھارت'' اور ہندی روزنامہ ''وشو بندھو'' کے نائب مدیر کی ذمے داریاں سنبھالیں۔ اس کے ساتھ ہی الائیڈ پریس سروس کے نام سے اپنی نیوز ایجنسی بھی شروع کر دی تھی۔ یہ ایجنسی آزادی کے بعد بھی کئی برسوں تک چلتی رہی۔ 1945 میں آپ دہلی آ گئے اور روزنامہ ''تیج'' کے جوائنٹ ایڈیٹر ہونے کے ساتھ ساتھ فری پریس جرنل ممبئی کے نامہ نگار بھی بن گئے۔ جولائی 1947 سے اکتوبر 1955 تک آپ روزنامہ ''تیج'' کے ایڈیٹر رہے۔ اس کے بعد دہلی کے ایک اور روزنامے ''سنسار'' کی ادارتی ذمے داریاں نبھائیں۔ وہ اس قدر ذہین اور حاضر دماغ صحافی تھے کہ خبروں کی اشاعت میں سبقت کے معاملے میں انھوں نے بڑے بڑے انگریزی اخبارات کو بھی کئی بار پیچھے چھوڑا تھا۔ اپریل 1956 میں انھوں نے اپنا ہفت روزہ ''سویرا'' شروع کیا جسے بعد میں روزنامہ کر دیا تھا۔ جمنا داس اختر اپنی تمام تر صحافتی مصروفیات کے ساتھ ساتھ پنجاب یونیورسٹی میں جرنلزم ڈپلوما کورس

جمنا داس اختر کو ملنے والے اعزازات

دلی انتظامیہ کی جانب سے ایوارڈ (برائے صحافتی و ادبی خدمات)

☆اردو اکادمی دھلی کا ایوارڈ (برائے صحافتی وادبی خدمات) ☆انجمن ترقی اردو برمنگھم کی جانب سے اعزاز (1980) ☆محکمه السنه پنجاب کی جانب سے اعزاز و خیر مقدمی تقریب 1990 ☆ ماتری شری ایوارڈ (برائے صحافتی و ادبی خدمات) ☆ال پاکستان پریس کلب کراچی میں استقبالیه (1990)☆1999 ال انڈیا ایڈیٹرز کانفرنس کی ڈائمنڈ جبلی کے موقع پر انهیں گول میڈل سے نوازا گیا۔ برصغیر کی مختلف ادبی و صحافتی تنظیموں اور انجمنوں کی جانب سے استقبالیے، ایوارڈز و اعزازات۔

کے جز وقتی لکچرر بھی رہے۔ 1975 سے 1983 تک روزنامہ ''نوائے وقت'' لاہو ر کے لیے کالم نویسی کی۔ اس کے بعد 1977 سے 1992 تک روزنامہ ''جنگ'' کراچی اور انگریزی اخبار ڈیلی نیوز، اور فنیک کے خصوصی نامہ نگار بھی رہے۔ 1980 میں انھوں نے ایک سال انگلینڈ میں رہ کر'' پائنیر'' لکھنؤ کی نمائندگی کی، چند سال پہلے تک وہ لندن کے اخبار'' ساؤتھال گزٹ'' اور کناڈا کے'' انڈو کناڈین ٹائمز'' کے انڈین کارسپانڈنس بھی رہے۔ جمنا داس اختر کے صحافتی مرتبے کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ 1949 سے لے کر آخر تک آل انڈیا نیوز پیپرس ایڈیٹرس کانفرنس کے رکن رہے۔ 91-1989 کے دوران آپ پریس کونسل آف انڈیا کے ممبر اور حیدرآباد کی آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس کے صدر بھی رہے۔ اردو کے ایک سینئر اخبار نویس اور برصغیر کے ماہر سیاسیات کے طور پر بی بی سی اور وائس آف امریکہ نے آپ کے انٹرویو نشر کیے۔ جمنا داس اختر نے نہ صرف جنگ آزادی کے زمانے میں ایک سچے وطن پرست صحافی کا کردار ادا کیا بلکہ آزادی وطن

بہت سی ہندو سکھ لڑکیوں کو آزاد کرایا۔ اسی طرح ہندوستان میں بہت سی مسلمان مغویہ لڑکیوں کو سکھوں اور ہندوؤں سے آزاد کرا کر پاکستان بھیجا۔ جو بالکل بے سہارا تھیں ان کے بھائی اور باپ بن کر ان کے نکاح مسلمان گھرانوں میں کرائے۔ انھوں نے اس کارِ عظیم میں رامیشوری نہرو، سردار لچھمن سنگھ گل، بنسی لال چوہان، پنڈت ہری دت شرما، ڈاکٹر شیر سنگھ اور مولانا امداد صابری جیسی شخصیتوں کا تعاون حاصل کیا۔ اس گروپ نے بڑی ہمت کے ساتھ بدقماشوں سے مسلمان لڑکیوں کو آزاد کرایا۔

آزادی کے بعد جب جمنا داس اختر روزنامہ'' تیج'' کے ایڈیٹر تھے، انھوں نے دہلی کے بازار حسن جی بی روڈ اور کاٹھ بازار کے اڈوں سے دو ہزار سے زائد خواتین کو عصمت فروشی کے ذلیل پیشے سے آزاد کرایا، اس کام میں انھیں کئی بار اپنی جان جوکھم میں ڈالنی پڑی اور قانونی الجھنوں سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ مبالغہ نہیں کہ جمنا داس اختر پنجاب کے کشادہ ذہن، سیکولر اور مذہبی رواداری کے علمبردار ہندوؤں کی آخری

جمنا داس اختر کی تصنیفات

(ناول) کانٹے ☆آنسو☆بردہ فروش ☆ کشمیر کی بیٹی ☆پنجاب کی بیٹی ☆بنگلہ دیش کی بیٹی ☆بارہ مولا ☆رادھا الزبتھ ☆سونا گاچھی ☆پاپی ☆تن کے اجلے من کے میلے ☆نیل کنٹھ ☆فرض کا دیوتا ☆ جلن ☆پائل ☆بگولے ☆کالے سائے ☆کالی گوری ☆ بھوانی جنکشن ☆بلیک میلر ☆نیل گگن ☆کچے دھاگے ☆عجیب لڑکی ☆کرپشن ☆ پھانسی کی کوٹھری سے ☆قاتل ☆ متعدد افسانے ☆اور خدا مرگیا (فسادات کی ڈائری)۔

انگریزی کتابیں

Stomsandtears (Novel), The Saga of Bangla Desh, Pak Espionage in India, Political Conspiracies in Pakistan, Volvementin Jammu and Kashmir

کے بعد آپ ایک نامور سماجی لیڈر بن کر بھی ابھرے۔ آپ شروع سے ہی ٹریڈ یونینسٹ تھے۔ 1943 میں رانا جنگ بہادر کے ساتھ آپ نے ورکنگ جرنلسٹ یونین قائم کی تھی بعد میں'' ٹائمز آف انڈیا'' کے مسٹر شیام لال کول کے اشتراک سے ہندوستان میں پہلی بار ورکنگ جرنلسٹ ایسوسی یونین شروع کی تھی۔ 1948 سے 1968 تک آپ آل انڈیا پوسٹ مین یونین کے جنرل سکریٹری، ممبر ورکنگ کمیٹی نیشنل فیڈریشن آف پوسٹ اینڈ ٹیلی گراف یونینز اور ممبر نیشنل کونسل آف کنفڈ ریشن آف فیڈ ریشنز آف گورنمنٹ ایمپلائیز رہے۔ ان حیثیتوں سے آپ نے ملک بھر کے دورے کیے۔ سرکاری ملازمین کے حقوق کو لے کر کئی اہم ہڑتالوں کی قیادت کی۔ آپ کو محکمہ ڈاک وتار نے یونیفارم کمیٹی میں غیر سرکاری رکن بھی نامزد کیا۔

تقسیم وطن نے ان کے دل کو زبردست صدمہ پہنچایا تھا۔ 1947 کے ہنگاموں میں سیکڑوں خواتین دونوں ملکوں میں اغوا کی گئی تھیں۔ انسانی قدروں کا یہ علمبردار ان مظلوم خواتین کی بازیابی اور آبادکاری کے کام میں جٹ گیا۔ انھوں نے پاکستان جاکر لاہور، شیخوپورہ، لائل پور، جھنگ اور شورکوٹ وغیرہ مقامات سے

پیڑھی کے مقتدر نمائندے تھے جنھوں نے 1947 کی قیامت صغریٰ سے گزرنے کے باوجود نفرت اور فرقہ واریت کا چولا نہیں پہنا، پاکستان کی اپنی جنم بھومی، اپنے مسلمان دوستوں اور بھائی بہنوں سے ان کے رشتے مسلسل قائم رہے۔

انھوں نے 1948 میں پہلی بار اس ماحول میں، جب ہندو مسلم دشمنی شباب پر تھی،'' انڈو پاک پریم سبھا'' قائم کر کے دونوں ملکوں کے عوام کو پیغام دیا کہ دونوں ملکوں کی تعمیر وترقی، امن اور بھائی چارے میں ہی مضمر ہے۔ انھوں نے زندگی بھر دونوں ملکوں کو قریب لانے کے لیے اپنے قلم کو ہمیشہ سرگرم رکھا۔ آپ پاکستان کے سیاسی، مذہبی، تہذیبی اور اقتصادی امور کے ماہرین میں شمار کیے جاتے تھے۔ انھیں اپنی سرزمین پاکستان اور وہاں کے ساتھی سنگی کتنے عزیز تھے اس کا نظارہ 1989 میں دیکھنے میں آیا تھا جب انھوں نے اپنی شادی کی 50ویں سالگرہ لاہور جاکر اپنے بچپن کے ساتھیوں اور دوستوں کے ساتھ منائی، لاہور میں ان کی تجدید شادی اس طرح ہوئی کہ باقاعدہ بارات نکلی جس کی اگوائی'' نوائے وقت'' کے ایڈیٹر مرحوم مجید نظامی نے کی تھی اور نامور اداکار محمد علی کی بیگم زیبا مرحومہ نے بہن بن کر جمنا داس اختر کے سر پر سہرا باندھا تھا۔

□□□

امریکہ میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے

□ کسی طالب علم کو درخواست دینے کا عمل کب شروع کرنا چاہیے؟

امریکہ کی کسی یونیورسٹی میں داخلے کی جو تاریخ آپ کے ذہن میں ہو اس سے کم از کم 18 ماہ قبل۔ مثال کے طور پر آپ اگر اگست/ستمبر 2011 میں داخلے کے خواہشمند ہیں تو آپ کو یہ کوشش اپریل 2010 میں شروع کر دینی چاہیے۔ پروگرام کی آخری تاریخ کے بارے میں آپ کا یقینی ہونا لازمی ہے۔

□ امریکی یونیورسٹیوں میں داخلے کی درخواست دینے پر کیا خرچ آتا ہے؟

اندازے کے مطابق اوسطاً 50,000 روپے کی رقم سات یونیورسٹیوں میں داخلے کی درخواست دینے پر خرچ ہو سکتے ہیں۔ اس رقم میں معیاری داخلہ ٹیسٹ فیس، درخواست فیس کے علاوہ ٹیلیفون، فیکس اور میل کے اخراجات شامل ہیں۔

□ امریکہ میں تعلیم حاصل کرنے کا سالانہ اوسط خرچ کیا ہے؟

امریکہ میں پڑھنے اور کھانے رہنے پر سالانہ خرچ 25,000 ڈالر سے 50,000 ڈالر تک ہو سکتا ہے۔

□ ہندوستان کی کسی یونیورسٹی سے حاصل کی گئی تین سال کی کالج ڈگری کیا امریکہ کے گریجویٹ اسکولوں میں قابل قبول ہے؟

ہندوستان میں برطانیہ کے ماڈل کے مطابق تین سال کا ڈگری کورس بہت کارآمد ہوتا ہے اور اس میں مخصوص مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ جو لوگ امریکہ میں تعلیم حاصل کرنے کے آرزومند ہیں ان کے لیے یہ ڈگری بیشتر اسکولوں میں امریکی ڈگری کے برابر نہیں ہے گو کہ ایسی امریکی درسگاہوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا ہے جہاں ہندوستان سے حاصل کی گئی تین سال کی ڈگری قبول کر لی جاتی ہے۔ امریکہ میں تین سال کے ڈگری کورس کر کے آنے والے طلبہ کو کون سا راستہ اختیار کرنا ہے اس سوال کے ایک سے زائد جواب ہیں۔ ایک سال کی کمی کی مناسب مداوائی تدبیروں کے بارے میں مختلف درسگاہیں مختلف ڈھنگ سے سوچتی ہیں۔ تین سال کا ڈگری کورس اور فاضل ڈگریاں رکھنے والے طلبہ چاہتے ہیں کہ ان کی ڈگریوں کی پیشہ ورانہ تخمیناتی تنظیموں سے پرکھ کرائی جائے اور وہ دینی درخواستوں کے ساتھ یہ پروفیشنل رپورٹ شامل کر کے درخواست کو مزید مستحکم بنالیں۔

□ ہندوستان کے انگلش میڈیم اسکول میں پڑھنے کے باوجود مجھ سے ٹوفل (ٹی او ای ایف ایل) ٹیسٹ پاس کرنے کے لیے کیوں کہا گیا ہے؟

امریکہ کی کلاسوں میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے کسی طالب علم کا انگریزی زبان میں اہل ہونا اہم ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ انگلش میڈیم اسکولوں میں پڑھنے والے ہندوستانی طلبہ میں انگریزی لکھنے، پڑھنے، بولنے، سننے اور سمجھنے کی اہلیت ہو لیکن ٹوفل جیسا ایک معیاری ٹیسٹ زبان کے ان ہی پہلوؤں کی جانچ کے لیے ایک منصفانہ تدبیر ہے۔ ٹوفل (ٹیسٹ آف انگلش ایز اے فارین لینگویج) انگریزی بولنے والے غیر امریکیوں کی امریکی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بولی، لکھی اور سنی جانے والی انگریزی کو استعمال کرنے اور سمجھنے کی اہلیت کی پیمائش کرتا ہے۔

□ درخواست دینے کے لیے مجھے کن معیاری ٹیسٹوں سے گزرنا ہوگا؟

امریکہ میں تعلیم کے لیے جو انتہائی عام معیاری ٹیسٹ ضروری ہیں ان میں انڈر گریجویٹ تعلیم کے لیے سیٹ (اسکالسٹک اپٹی چیوڈ ٹیسٹ آف ریزننگ ایبلیٹی) اور گریجویٹ تعلیم کے لیے گریجویٹ ریکارڈ اگزامنیشن (جی آر ای) اور گریجویٹ مینجمنٹ اپٹی چیوڈ ٹیسٹ (جی ایم اے ٹی) شامل ہیں۔

معیاری ٹیسٹ کی ضرورت اس بنیاد پر بدلتی رہتی ہے کہ آپ کس کلاس میں داخلہ چاہتے ہیں اور کن اہم مضامین کی تدریس کے خواہش مند ہیں۔ مثال کے طور پر اگر آپ امریکہ میں انڈر گریجویٹ تعلیم کے لیے جانا چاہتے ہیں تو آپ کو ایس اے ٹی ٹیسٹ دینا پڑے گا۔ اسی طرح سائنس، ہیومنٹیز اور انجینئرنگ میں اگر آپ گریجویٹ تعلیم حاصل کرنے کے خواہش مند ہیں تو آپ کو جی آر ای ٹیسٹ سے گزرنا ہوگا۔ بعض درسگاہیں یہ چاہیں گی کہ اگر آپ ماسٹرز ڈگری یا پی ایچ ڈی ڈگری کے لیے امریکہ کے کسی تعلیمی ادارے میں داخلہ لینا چاہتے ہیں تو آپ کو اور بھی زیادہ مخصوص جی آر ای ٹیسٹ دینا پڑے گا جو کہ جی آر ای سبجیکٹ ٹیسٹ کہلاتا ہے۔ جو طلبہ بزنس میں ماسٹرز ڈگری حاصل کرنے کے خواہش مند ہوں ان کے لیے زیادہ مناسب ٹیسٹ جی ایم اے ٹی ہے۔ تعلیم کے پیشہ ورانہ شعبوں میں داخلے کے لیے کچھ اور معیاری ٹیسٹ بھی ہیں جیسے کہ ڈینٹل ایڈمیشن ٹیسٹ (ڈی اے ٹی)، میڈیکل کالج ایڈمیشن ٹیسٹ (ایم سی اے ٹی) اور اسکول ایڈمیشن ٹیسٹ (ایل ایس اے ٹی) ٹیسٹ کے بارے میں مزید معلومات کے لیے ان ویب سائٹوں پر جائیں

www/ada.org; www/ets.org; www.gmac.org; www.lsacorg; www.usmle.org

□ امریکہ کے کسی کالج یا یونیورسٹی کا پڑھائی کے لیے انتخاب کرتے وقت درجہ بندی (رینکنگ) کے لیے ہندوستانی طلبہ کو کن چیزوں پر دھیان دینا چاہیے؟

امریکہ میں بہت سی تنظیمیں اور رسائل امریکی یونیورسٹیوں کی درجہ بندی شائع کرتے ہیں۔ طلبہ کو اس بات سے واقف ہونا چاہیے کہ بہت سی یونیورسٹیاں رینکنگ رپورٹ کے لیے کیے جانے والے جائزوں میں شرکت نہیں کرتیں اس کے علاوہ طلبہ پر لازم ہوتا ہے کہ وہ درجہ بندی کے طریقہ کار ہوشیاری سے پڑھیں۔

طلبہ کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ایک ایسی یونیورسٹی کا انتخاب کریں جو ان کے لیے موزوں ہوں۔ وہ یونیورسٹی پروگرام کے معیار، اساتذہ، نصاب، کلاس پروفائل، داخلے کی ضروریات، مالی امداد کی دستیابی، یونیورسٹی کے احاطے کی رنگارنگی اور انٹرن شپ/ پریکٹیکل ٹریننگ متبادل پروگراموں کی صورت میں ان کی ضرورتوں کی تکمیل کرتی ہوں۔ اپنی ضرورتوں کی بنیاد پر طلبہ کو چاہیے کہ وہ اپنی رینکنگ لسٹ بنائیں۔

طلبہ کسی یونیورسٹی کا انتخاب کرتے وقت اس کو بنیاد نہ بنائیں کہ وہ یونیورسٹی بہت معروف ہے یا بہت مشہور ہے بلکہ اس بات کو بنیاد بنائیں کہ وہ ان کے لیے کس حد تک مناسب ہے۔ یونیورسٹی کو چاہیے کہ علمی، سماجی اور مالی سطح پر طالب علم کی جو بھی ضرورت اور جو بھی خواہش ہے اس کی تکمیل کر سکے۔

□ امریکہ میں ہندوستانی طلبہ کے لیے روزگار کے امکانات کیا ہیں؟

بین الاقوامی طلبہ کے لیے روزگار کے امکانات بہت محدود ہیں۔ اپنی پڑھائی کا خرچ اٹھانے میں ہاتھ بٹانے کے لیے جز وقتی کام سے کچھ پیسہ کمانے کو بنیاد بنا کر امریکہ میں تعلیم حاصل کرنے کی منصوبہ بندی نہیں کرنی چاہیے۔

یونیورسٹی کے احاطے میں: اگرچہ بین الاقوامی طلبہ کو یونیورسٹی کے احاطے کے اندر کام کرنے کی اجازت ہے لیکن اول تو یہ کام حاصل کرنا اکثر دشوار ہوتا ہے اور دوئم اس سے اتنے پیسے نہیں ملتے کہ تعلیم کا پورا خرچ اٹھایا جا سکے۔ اس کے علاوہ یونیورسٹی کے احاطے میں جو کام مل جاتے ہیں ان کے لیے ضروری نہیں ہے کہ ان کا تعلق اسی شعبہ تعلیم سے ہو جس شعبے میں طالب علم پڑھائی کر رہا ہے۔ یونیورسٹی کے احاطے کے اندر کوئی بھی طالب علم ہفتہ میں 20 گھنٹے کام کر سکتا ہے۔

عملی تربیت: یہاں عملی تربیت کے مواقع بھی مل سکتے ہیں جن کے دوران کچھ روز کا باضابطہ روزگار بھی مل جاتا ہے۔ روزگار کا یہ موقع غیر ملکی طلبہ کے لیے نکالا گیا ہے تاکہ وہ اپنی تعلیم کے شعبے سے تعلق رکھنے والے پیشہ ورانہ کام کاج کا تجربہ حاصل کر سکیں اس سلسلے میں مخصوص معلومات کے لیے داخلہ مل جانے کے بعد یونیورسٹی میں غیر ملکی طلبہ کے صلاح کار سے رابطہ قائم کرنا چاہیے۔

امریکی اداروں میں احاطے کے اندر اور احاطے کے باہر بھی انٹرن شپ کے متعدد مواقع دستیاب ہیں جو ہر یونیورسٹی یا کالج کے ویب سائٹ پر عموماً دیے ہوئے ہوتے ہیں۔ طالب علم کو چاہیے کہ وہ اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ اس کی انٹرن شپ کی پوزیشن اہلیت اور قانونی ضرورتوں پر کھری اترتی ہو، اس ادارے کے کیریئر سینٹر میں صلاح کار سے مشورہ کرے۔

(مرتبہ: شیونتی نارائن، کنٹری کوآرڈی نیٹر، تعلیمی مشاورتی خدمات، یو ایس انڈیا ایجوکیشنل فاؤنڈیشن)

امریکی اسٹوڈنٹ ویزا کے بنیادی ضابطے

کوئی امریکی ادارہ جیسے ہی آپ کو طالب علم کے طور پر تسلیم کر لے آپ کو فوراً چند کارروائیاں کرنی چاہئیں تاکہ آپ کو بروقت امریکی ویزا مل سکے۔ پیشگی منصوبہ بندی بہت ضروری ہے تاکہ آپ اپنے سفر کے آغاز سے مہینوں پہلے ساری تیاریاں شروع کر دیں۔

اقدامات: جب کوئی کالج یا یونیورسٹی آپ کو تسلیم کر لے اس کے بعد، لیکن ویزا کی درخواست دینے سے پہلے آپ کے نئے اسکول کو چاہیے کہ وہ درکار دستاویز آپ کے پاس بھیج دے، جس میں ''اسٹوڈنٹ اینڈ ایکسچینج وزیٹر انفارمیشن سسٹم، (ایس ای وی آئی ایس) میں آپ کا اندراج ہو۔ ایس ای وی آئی ایس ویب پر مبنی ایک اطلاعاتی نظام ہے، جس میں غیر ملکی طلبہ اور تبادلہ پروگراموں کے شرکا کی تفصیلات درج ہوتی ہیں جس کے ذریعے مختلف ادارے اور حکومتی ایجنسیاں طلبہ اور تبادلہ پروگراموں کے تحت آنے والوں کے امریکہ میں سفر اور ملک میں ان کے قیام کے دوران ان کے متعلق معلومات حاصل کرتی ہیں۔

ایس ای وی آئی ایس میں اندراج کے لیے آپ کو اس کی فیس دینی ہوتی ہے اور اس کی رسید کو ثبوت کے طور پر احتیاط سے رکھنا ہوتا ہے تاکہ امریکی سفارت خانے یا کسی قریبی قونصل خانے میں ویزا کے لیے انٹرویو کے وقت پیش کر سکیں۔ آپ جس طرح کی تعلیم یا تبادلہ پروگرام میں شرکت کرنا چاہتے ہیں اور جس قسم کے ویزا کے لیے درخواست دے رہے ہیں اس کے مطابق یہ فیس مختلف ہوا کرتی ہے۔ مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے دیکھیے:

http://newdelhi.usembassy.gov/visasevis.html

امریکی سفارت خانے یا قریبی قونصل خانہ سے رابطہ کر کے ویزا انٹرویو کے لیے وقت لیجیے۔ یہ معلومات آپ کو اس سائٹ پر ملیں گی:

http://newdelhi.usembassy.gov/applyingfjm.html

ویزا پراسسنگ کے طریقے مختلف ہو سکتے ہیں لیکن سبھی اسٹوڈنٹ ویزا اور ایکسچینج وزیٹر ویزا کے درخواست دہندگان کو اولیت دی جاتی ہے۔ آپ کے

لیے انتظار کی مدت اور انٹرویو کے وقت اور آپ کی درخواست کی پراسسنگ حسب ذیل سائٹ پر موجود ہوتی ہیں:

http://www.travel.state.gov/visa/temp/wait/tempvisitors_wait.php

جب آپ کو انٹرویو کا وقت مل جائے تو ساری درکار دستاویزات اکٹھا کیجیے جن میں حسب ذیل شامل ہیں:

- ایس ای وی آئی ایس فیس کی ادائیگی کی رسید
- ویزا کا اہل قرار دینے والی وہ دستاویز جو تعلیمی ادارے نے آپ کے پاس بھیجی ہے۔
- مالی فراہمی کی دستاویزات
- ویزا پراسسنگ کی فیس
- باقاعدہ پُر کیا ہوا ویزا کی درخواست کا فارم

مزید براں اس سائٹ پر معلومات کو دیکھیے:

http://newdelhi.usembassy.gov/required_documents.html

آپ کو جاننا چاہیے کہ صرف ویزا امریکہ میں داخلے کی ضمانت نہیں ہے۔ ویزا رکھنے والے کسی غیر ملکی شہری کو صرف امریکہ میں داخلے کے مقام تک جانے کی اجازت ہے۔ وہاں پہنچنے کے بعد امریکی کسٹم افسروں اور سرحدوں کے محافظ افسروں کو ملک میں داخل ہونے کی اجازت دینے کے فیصلے کا اختیار ہوتا ہے۔

ویزا حاصل کرنے کی کارروائی پیچیدہ معلوم ہوتی ہے لیکن یاد رکھیے کہ 2008 میں امریکہ جانے کے لیے نان امیگرنٹ ویزا حاصل کرنے کے لیے 66 لاکھ لوگوں کو ان کارروائیوں سے گزرنا پڑا۔

حقائق: ویزا حاصل کرنے میں مشکلوں کے متعلق بڑی غلط فہمیاں ہیں۔ آیئے بعض حقائق پر نظر ڈالیں۔

غلط فہمی 1: امریکہ میں داخل ہونے والے طلبہ کی تعداد محدود رکھنے کے لیے ویزا کا کوٹہ معین کیا جاتا ہے۔

حقیقت: دنیا بھر میں امریکی سفارتخانوں اور قونصل خانوں سے جاری کیے جانے والے اسٹوڈنٹ ویزا کی تعداد کی کوئی حد معین نہیں ہے۔ اگر آپ اسٹوڈنٹ ویزا کے لیے درخواست دہندگی کے اہل ہیں اور کسی امریکی تعلیمی ادارے میں آپ کو ایڈمیشن مل گیا ہے تو محکمہ خارجہ چاہتا ہے کہ آپ اس موقع سے استفادہ کریں۔

غلط فہمی 2: اگر میں کسی تعلیمی ایجنٹ کی خدمات حاصل کرلوں تو ویزا ملنے کے امکانات بہتر ہو جائیں گے۔

حقیقت: اگر کوئی آپ سے کہے کہ وہ ویزا حاصل کرنے میں آپ کی مدد کرسکتا ہے تو اس کا یقین نہ کیجیے۔ ایسے کسی شخص کو نہ پیسہ دیجیے نہ اس سے کوئی معاہدہ کیجیے۔ جو لوگ ویزا حاصل کرنے میں مددگار ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں ایسے لوگوں کی حکومت امریکہ تک کوئی خصوصی رسائی نہیں ہوتی۔

اگر آپ ویزا ویب سائٹوں پر درج اطلاعات کو احتیاط سے پڑھیں اور آخری تاریخ سے پہلے ضروری کام انجام دے لیں تو سارا کام خوش اسلوبی سے ہو جائے گا۔

غلط فہمی 3: ویزا کی درخواست دینے والے کے لیے کم سے کم آمدنی کا ثبوت پیش کرنا ضروری ہے۔

حقیقت: اسٹوڈنٹ ویزا کی درخواست دینے والوں کے لیے ایسا مالی ثبوت پیش کرنا ضروری ہے جس سے ظاہر ہو کہ خود آپ کے پاس یا آپ کے والدین یا سرپرست کے پاس اتنے پیسے ہیں جس سے آپ کی ٹیوشن فیس اور مطالعہ کے دوران امریکہ میں آپ کے قیام کے اخراجات پورے ہوسکیں۔

غلط فہمی 4: صرف انتہائی تعلیمی صلاحیت والوں کو ویزا ملتا ہے۔

حقیقت: بہت ہی اچھے طلبہ کے لیے ویزا ریز رو نہیں ہوتا، بلکہ اس کا دارومدار امریکہ میں کسی کالج یا یونیورسٹی کی طرف سے منظوری پر ہوتا ہے۔ جب آپ کسی تعلیمی ادارے میں داخل ہو جاتے ہیں یا کسی تبادلہ پروگرام میں آپ کی شرکت منظور ہو جاتی ہے تو وہ ادارہ آپ کو وہ فارم فراہم کرے گا، جو ایس ای وی آئی ایس کے مطابق درکار ہوتا ہے۔ جب آپ ویزا کی درخواست دیں تو اس فارم کو بھی پیش کرنا ہوتا ہے۔ سفارت خانے کا جو افسر آپ کا انٹرویو لے گا اس کو قائل کرنا ہوگا کہ آپ ایک سنجیدہ طالب علم ہیں اور داخلہ دینے والے ادارے سے بخوبی واقف ہیں۔ آپ کو یہ بھی بتانا چاہیے کہ آپ کا مطالعہ کا پختہ منصوبہ ہے اور آپ جس مضمون کا مطالعہ کررہے ہیں اس سے کافی واقفیت رکھتے ہیں۔

غلط فہمی 5: سفارتی افسر صرف آپ کے جوابات اور ایمانداری سے آپ کے ذاتی حالات کو سننا چاہے گا۔

غلط فہمی 6: آپ کو ویزا اسی وقت ملتا ہے جب آپ کی انگریزی اچھی ہو۔

حقیقت: اگر آپ امریکہ میں انگریزی کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں تو انگریزی میں اچھی لیاقت ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ویزا کی درخواست دینے والے طالب علم میں سفارتی افسر صرف یہ دیکھے گا کہ اس کو انگریزی زبان پر کتنا عبور حاصل ہے۔ لیکن جے ا تبادلہ ویزا کے درخواست گزاروں سے انگریزی زبان میں کافی لیاقت کی شرط ہوگی۔

غلط فہمی 7: آپ کو ویزا اسی صورت میں ملے گا جب امریکہ میں آپ کا کوئی

رشتہ دار ہو۔

حقیقت: یہ سچ نہیں ہے۔ سفارتی افسر ویزا انٹرویو کے دوران امریکہ میں رشتے داروں کے بارے میں اسی طرح پوچھ سکتا ہے، جس طرح ہندوستان میں آپ کے خاندانی حالات کے بارے میں پوچھ سکتا ہے۔

غلط فہمی 8: اسٹوڈنٹ ویزا لے کر امریکہ جانے والے بین الاقوامی طلبہ کو وہاں کام کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔

حقیقت: کام کے کچھ مواقع ممکن ہیں خصوصاً کیمپس کے اندر، محدود وقفہ کے لیے ورک اسٹڈی پروگراموں میں۔

غلط فہمی 9: ویزا حاصل کرنے کے لیے آپ کو اپنے سارے مستقبل کا منصوبہ تیار کرنا چاہیے۔

حقیقت: آپ کو اپنے دافعی مطالعے کے منصوبے پر گفتگو کے قابل ہونا چاہیے نہ کہ اپنی ساری عملی زندگی کے تفصیلی منصوبے کے متعلق۔

غلط فہمی 10: اپنی ڈگری مکمل کرنے کے بعد فوراً آپ کو اپنے وطن واپس آ جانا چاہیے۔

حقیقت: آپ عملی تجربہ حاصل کرنے کے لیے امریکہ میں ایک سال تک اپنے میدان میں کام کرنے کے لیے اوپشنل پریکٹیکل ٹریننگ کی درخواست دے سکتے ہیں۔

طلبہ اور تبادلے میں شرکا کے لیے ویزا کی قسمیں:

ایف۔ ایا اسٹوڈنٹ ویزا: یہ ویزا ان لوگوں کے لیے ہے، جو امریکہ کے کسی تسلیم شدہ کالج یا یونیورسٹی میں مطالعہ کرنا چاہتے ہوں یا کسی یونیورسٹی یا لسانی ادارہ میں انگریزی کا مطالعہ کرنا چاہتے ہوں۔

جے۔ ایا ایکسچینج وزیٹر ویزا: یہ ویزا ان لوگوں کو جاری کیا جاتا ہے، جو کسی تعلیمی یا ثقافتی تبادلے کے پروگرام میں شرکت کے لیے جانے والے ہوں گے۔

ایم۔ ایا اسٹوڈنٹ ویزا: یہ ویزا ان لوگوں کے لیے ہے جنھوں نے کسی غیر تعلیمی یا پیشہ ورانہ پروگرام میں داخلہ لیا ہو۔

(امریکی محکمہ خارجہ کے شعبہ برائے بین الاقوامی اطلاعاتی پروگرام سے ماخوذ)

امریکہ میں حصول تعلیم کے لیے مالی امداد

امریکہ میں تعلیم کا حصول ہندوستانی طلبہ و طالبات کے لیے ایک بڑا دانش ورانہ اور ثقافتی تجربہ ہوتا ہے لیکن اس تجربہ پر آنے والے اخراجات کا بندوبست کرنا دشوار ہو سکتا ہے۔ طلبہ کے لیے ہندوستان سے روانہ ہونے سے قبل تعلیمی اخراجات اٹھانے کے بندوبست سمیت امریکہ میں اپنی تعلیم کی مکمل منصوبہ بندی ضروری ہے۔ شروع میں یونیورسٹی کا داخلہ فارم بھرتے وقت اس کی وضاحت لازمی ہے کہ وہ مالی مدد کی درخواست کر رہے ہیں۔ یاد رہے کہ اس معاملے میں مقابلہ بہت سخت ہوتا ہے۔ آخری تاریخ گزرنے سے پہلے درخواست دینا لازمی ہے اور اس کی پرزور سفارش کی جا سکتی ہے کہ درخواست جس قدر جلد داخل کر دی جائے بہتر ہے۔

یو ایس انڈیا ایجوکیشن فاؤنڈیشن (یو ایس آئی ای ایف) میں تعلیمی صلاح کار لوناداس بنکیا نے بتایا کہ ''طلبہ کے لیے لازمی ہے کہ وہ اپنی درخواست بھرپور تیار کریں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ درخواست ہر اعتبار سے مکمل ہو، یونیورسٹی جیسی درخواست کی خواہش مند ہے ویسی ہی ہو، کہیں کوئی غلطی نہ رہے۔ طلبہ جو بہت بڑی غلطیاں کرتے ہیں ان میں سے ایک غلطی یہ ہے کہ وہ امریکہ کی کسی درس گاہ میں داخلہ لینے کی کوشش کا آغاز بہت دیر سے کرتے ہیں۔''

مختلف درس گاہوں میں مختلف فیس لی جاتی ہے لیکن سرکاری کالجوں اور یونیورسٹیوں کی فیس نجی کالجوں اور یونیورسٹیوں کی فیس سے کم ہے۔ آپ کو صرف فیس، ٹیوشن، کتابوں اور امریکہ آنے جانے کے اخراجات کے بارے میں ہی سوچنا نہیں ہوتا بلکہ قیام، طعام، دواؤں، کپڑوں اور سماجی سرگرمیوں پر آنے والے اخراجات کے بارے میں بھی غور کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔

ان چیزوں کے اخراجات بھی ہر جگہ ایک نہیں ہیں۔ یہ گھٹ بڑھ سکتے ہیں۔ اخراجات کے گھٹنے یا بڑھنے کا دارومدار اس پر ہے کہ آپ جس درسگاہ میں داخلہ لینا چاہتے ہیں وہ کہاں واقع ہے؟ کسی بڑے شہر میں یا چھوٹے سے قصبے میں، کسی جزیرے یا سیاحوں کی دلکشی کے کسی مقام پر؟ امریکہ میں بعض یونیورسٹیاں ایسے مقامات پر واقع ہیں جہاں جاڑوں میں برف پڑتی ہے۔ وہاں آپ کو بھاری بوٹوں اور کوٹ کی ضرورت پڑے گی۔ جن کا استعمال ہو سکتا ہے کہ، آپ کو ہندوستان میں نہ کرنا پڑے۔

بہت سی امریکی یونیورسٹیاں ہونہار انڈر گریجویٹ طلبہ و طالبات کو کہیں جزوی، کہیں کلی مالی اعانت دیتی ہیں۔ امریکہ کے اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کے ایجوکیشن یو ایس اے نیٹ ورک کے مطابق امریکہ کے 100 کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بین الاقوامی طلبہ کو ہر سال 1000 اسکالرشپ دی جاتی ہے۔

مکمل اسکالرشپ حاصل کرنے کے لیے یہ لازمی ہے کہ آپ ہندوستان کے بہترین طالب علم ہوں اور تقریباً ہر مضمون میں آپ کے عمدہ نمبر آئے ہوں۔ حصول علم کی چاہت کا امتحان (ایس اے ٹی) اور بطور غیر ملکی زبان انگریزی کا امتحان (ٹوفل) کے نمبرات اچھے ہوں اور آپ نے قیادت و عوامی خدمت جیسے شعبوں میں گراں قدر خدمات انجام دی ہوں۔

بنکیا کا کہنا ہے کہ عام طور پر سائنس، فزکس، کیمسٹری، بایومیڈیکل

سائنس میں تعلیم کے لیے اور پی ایچ ڈی کے لیے طلبہ کو زیادہ فنڈ مل جاتا ہے۔
آپ اپنے تعلیمی بجٹ کی منصوبہ بندی کرتے وقت پیسوں کی بچت کے لیے درج ذیل طریقوں پر غور کر سکتے ہیں۔

بہترین سودا: ایسے کالج تلاش کیجیے جو سب سے کم ٹیوشن خرچ پر سب سے زیادہ معیاری تعلیم دیتے ہیں۔

کم وقت میں نصاب کی تکمیل: اگر آپ چار سال کا بیچلرس ڈگری کورس تین برس میں مکمل کرنے کے لیے گرمیوں کے دوران بھی کلاس میں حاضری دیتے ہیں اور ہر سمسٹر میں ایک فاضل کورس پورا کر لیتے ہیں تو آپ ہزاروں ڈالر بچا سکتے ہیں۔

ٹیوشن فیس کی معافی: اگر آپ کا تعلیمی ریکارڈ بہت اچھا ہے تو اس سے بھی آپ پیسے بچ جائیں گے۔ پہلے سال میں آپ کو ملنے والے گریڈ کی بنیاد پر بعض ٹیوشن فیس میں جزوی رعایت کر دیتے ہیں۔

قیام کے اخراجات: کسی عام ڈورمیٹری میں رہائشی معاون بن جانے سے بھی آپ کے پیسے بچتے ہیں۔ ڈائننگ ہال میں کام کرنے کے عوض میں ایک تو آپ کو معمولی تنخواہ ملتی ہے اس کے علاوہ آپ کے کھانے کا ایسا بندوبست ہو جاتا ہے جس میں ''جو کھا سکیں کھائیے'' کی سہولت رہتی ہے۔ اگر مناسب رہائش دستیاب ہو جائے اور سرکاری ٹرانسپورٹ بھی خاطر خواہ ہو تو یونیورسٹی کے باہر کسی رشتہ دار یا دوست کے یہاں قیام سے بھی پیسے بچتے ہیں۔

دو سال اور کمیونٹی کالج: بہت سے طلبہ ابتدائی دو برسوں کے دوران کمیونٹی کالجوں میں پڑھائی کر کے ٹیوشن کی مد میں ہزاروں ڈالر بچا لیتے ہیں۔ اس کے بعد اپنا ڈگری کورس مکمل کرنے کے لیے دو چار امیگریشن ضابطوں کے مطابق بین الاقوامی طلبہ کو صرف جز وقتی کام کرنے کی اجازت ہے۔ وہ اپنی پڑھائی کے پہلے سال کے دوران ہفتے میں صرف بیس گھنٹے کام کر سکتے ہیں اور وہ بھی یونیورسٹی کے احاطے کے اندر۔ آپ اگر ہفتے میں دس سے پندرہ گھنٹے بھی کام کر لیں تو آپ کو کتابوں، کپڑوں اور ذاتی اخراجات کے لیے خرچ کرنے کے لائق خاطر خواہ پیسہ مل جاتا ہے۔

امریکی درس گاہوں میں روزگار کے امکانات میں جو چیزیں شامل ہیں وہ یہ ہیں: پڑھانا؛ کسی پروفیسر یا محقق کی مدد کرنا؛ عام خواب گاہ میں رات کے وقت یا اختتام ہفتہ کے دوران فون کال وصولی اور مہمانوں کی خاطر داری کے لیے کام کرنا؛ کلاس روم کو سمعی بصری آلات فراہم کرنا؛ کیفے ٹیریا، کتاب کی دکان، کتب خانہ، ہیلتھ کلب یا انتظامی دفتروں میں کام کرنا؛ اپنے ہاتھ کے بنائے ہوئے دستکاری کے نمونے یا کھانے کا سامان بیچنا یا پھر یونیورسٹی کے اندر کرائے پر سائیکلیں دینے، دھلائی کے کپڑے اٹھانے اور لیپ ٹاپ کی مرمت کرنے جیسی خدمات فراہم کرنے والی کمپنی کا نمائندہ بن جانا۔

(رچا ورما، ایجوکیشن یو ایس اے اور یو ایس آئی ای ایف کے فراہم کردہ مواد کی بنیاد پر)

(یہ تینوں مضامین ''اسپین'' نئی دہلی کے ستمبر/اکتوبر 2009 کے شمارے سے شکریے کے ساتھ نقل کیے جا رہے ہیں)

□□□

کلیات راجندر سنگھ بیدی — جلد اول، جلد دوم

مرتب: وارث علوی

کلیات راجندر سنگھ بیدی کی پہلی جلد میں افسانے اور دوسری جلد میں بیدی کے ناولٹ، ڈرامے، مضامین، انشائیے، خاکے، خطبے، دوسروں کی کتابوں پر لکھے گئے دیباچے، تبصرے، تاثرات، تنقیدیں اور مختلف ادبی شخصیات کو لکھے گئے 31 خطوط ہیں۔ جلد اول میں مرتب نے راجندر سنگھ بیدی کی زندگی اور شخصیت کے علاوہ بیدی کے افسانوں کا تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ بھی پیش کیا ہے۔ اس کے بعد ان کے افسانوں کے ساتوں مجموعے — دانہ و دام، گرہن، کوکھ جلی، اپنے دکھ مجھے دے دو، ہاتھ ہمارے قلم ہوئے، مکتی بودھ اور اس کے علاوہ بیدی کے وہ افسانے بھی شامل ہیں جو ان کے کسی مجموعے میں نہیں ہیں۔ دوسری جلد میں ان کے ناولٹ 'ایک چادر میلی سی' اور ان کے ڈراموں کے دونوں مجموعے — بے جان چیزیں اور سات کھیل جن میں گیارہ ڈرامے ہیں۔ اس دوسری جلد میں بیدی کے فن پر وارث علوی کا مضمون ان کے فن کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

جلد اول: صفحات : 1040، قیمت : -/525 روپے / جلد دوم: صفحات : 655 قیمت : -/380 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

مرزا محمد زماں آزردہ

(ہماری مطبوعات سے)

مرزا دبیر کا ادبی مرتبہ

شاعری میں مرزا دبیر کا ادبی مرتبہ متعین کرنے میں اردو مرثیہ کے فنی لوازم کو مدِ نظر رکھنا ہوگا کیونکہ شاعر کے تخلیقی وفنی نظریات میں صنف ادب کے محرکات کو بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اسی کے دائرہ عمل میں شاعر اپنے فکر واحساس کی کیفیت پیش کرتا ہے جو انفرادی و ذاتی نوعیتوں کے باوجود تخلیقی معیاروں پر اجتماعی اور متنوع کیفیتوں کا مظہر بن جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ضروری نہیں کہ شاعر اپنے تخلیقی وفنی معیاروں کا بذاتہ احساس بھی کر سکے۔ ممکن ہے کہ اس کے قاری و ناقد کے احساس وادراک میں تخلیق کار سے اختلاف پیدا ہو جائے اس کی بدیہی مثال غالب ہیں جو اپنے اردو دیوان کو کہتے تھے: ''بگذر از ایں مجموعۂ اردو کہ بے رنگِ من است'' مگر بعد میں شہرت انھیں اسی اردو دیوان سے ملی، فارسی شاعری سے نہیں۔ مدِ نظر رہے کہ مرزا دبیر کے کلام کا تجزیہ کرنے میں اس حقیقت کو صرف نظر نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ اس مقالہ کے گزشتہ ابواب میں ان کی رباعیوں، غزلوں، قصیدوں، مثنویوں، سلاموں یہاں تک کہ نثری کارناموں کا تجزیہ کیا جا چکا ہے لیکن خصوصیت سے جو صنف سخن ان کی جولانی طبع اور خلاقیِ مضامین سے اتنی زیادہ بلند وآسودہ ہوئی کہ وہ اس کی آب وتاب کا مظہر ہے، اردو مرثیے ہیں جن میں ان کے طرز سخن کا ثانی ہنوز پیدا نہ ہو سکا۔ اس لیے مرزا دبیر کے ادبی مرتبے کا تعین کرنے میں مرثیہ کو خصوصیت سے سامنے رکھنا ہوگا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ دیگر اصناف سخن کا ذکر لایعنی ہے مگر صحیح معنوں میں جس صنف کی انھوں نے آبیاری کی، جس کی ترقی کے لیے کوشاں رہے، جس کو اپنی ایجاد پسند طبیعت سے مالا مال کیا، اس کے آئینے میں مرزا دبیر کی تصویر زیادہ صاف اور واضح نظر آئے گی۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی آبجیکٹ (Object) کو بجائے کناروں اور گوشوں کے سامنے سے دیکھنا زیادہ مناسب ہوگا تاکہ اس کا بیشتر حصہ نظر میں رہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض گوشوں کے نظر انداز ہو جانے کا امکان ہے مگر چہرہ خود بخود بتا دے گا کہ یہ کس کا ہے، اس کے ہاتھ پاؤں کیسے ہیں، نظر کیسی ہے۔ لہٰذا مرزا دبیر کے شاعرانہ مرتبہ اور معیار کو سمجھنے کے لیے ان کے مراثی کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

مرزا دبیر کے مراثی کا مطالعہ کر کے ان کے شاعرانہ درجہ کا اندازہ کرنے کے لیے یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ وہ اس صنف سخن کی ترقی وترویج میں کہاں تک اس کے ساتھ رہے۔ علاوہ بریں اس حقیقت پر بھی نظر رکھنا ضروری ہے کہ انھوں نے جب اپنے اظہار فن وکمال کے لیے مرثیہ کا انتخاب کیا تو اس کی حالت کیا تھی۔ قدمانے اس میں کون سی خصوصیات پیدا کی تھیں۔ اس کی ادبی وفنی نوعیتیں کیا تھیں اور مرزا دبیر کے معاصرین نے کن خصوصیات کی بنا پر امتیاز حاصل کیا۔ یہ ان کا غیر ارادی اور غیر شعوری عمل تھا یا اس کے پس پشت مثبت فنی رویہ کارفرما تھا۔ جس طرح خس وخاشاک کے ٹکڑے اس کے ساتھ سینکڑوں میل کا سفر کرتے ہیں مگر اس دھارے سے نکل کر ایک انچ چلنے کی سکت نہیں رکھتے اسی طرح ادب وفن میں تخلیق کار کی ارادی کوشش اور ارادی عمل کی اہمیت ہوتی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ مرزا دبیر نے ارادتاً اور عملاً مرثیہ کے ارتقا ونشو ونما میں کن پہلوؤں پر توجہ کی۔

مرزا دبیر کے فنی نظریے کے مطالعے میں اردو مرثیے کی تاریخ اور اس کے ارتقائی مدارج پر نگاہ ڈالنا ضروری ہے۔ اس مقالے کے تیسرے باب کی ابتدا میں اس پر تفصیل سے بحث ہو چکی ہے۔ یہاں مختصر سا تذکرہ کیا جائے گا۔

شمالی ہند میں مرثیہ کی طرف سودا اور میر کے دور سے خصوصی توجہ دی گئی مگر اس کی نوعیت ثانوی تھی۔ میر نے غزل اور مثنویوں کی طرف زیادہ توجہ مبذول کی جن میں انھیں معراج کمال حاصل ہوئی۔ ان کے نزدیک مرثیہ کی ثانوی حیثیت رہی۔ یعنی میر وسودا کی مرثیہ گوئی ایسی ہی ہے جیسے مرزا دبیر کی مثنوی نگاری یا غزل گوئی یا قصیدہ گوئی۔

مرزا دبیر نے مرثیہ کو اوّلیت دی۔ ان کی صلاحیتوں کو سامنے رکھا جائے تو یہ احساس ہوگا کہ وہ تقریباً تمام اصناف سخن میں اپنی صلاحیتوں کا اظہار کر کے بلند مرتبہ حاصل کر سکتے تھے مگر انھوں نے ارادتاً مرثیہ کہا جس کا بنیادی سبب یہ ہو سکتا ہے کہ وہ ذہنی طور پر اس کے قائل تھے کہ اہل بیتؑ کی مدح کرنا یا ان کے

''مرزا سلامت علی دبیر (حیات اور کارنامے)'' سے ماخوذ، مصنف: مرزا محمد زماں آزردہ، صفحات 592، قیمت : -/258

نوٹ : قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔

مصائب کا ذکر کرنا باعثِ نجات ہے۔ حوصلہ افزائی کی بات اپنی جگہ اہم ہے لیکن جب کسی کام کی ابتدا ہوتی ہے تو اس کے ظاہری انجام سے انسان بہت کم واقف ہوتا ہے۔ اس وقت میر خلیق اور میر ضمیر کی طرح کے بلند قامت مرثیہ گو موجود تھے۔ مگر مرزا دبیر آگے بڑھے اور گلستان مرثیہ میں ایسے پھول کھلائے جن کی مہک اب تک باقی ہے اور صاحبان علم اور قدر دانان فن کے دل و دماغ کو ان سے اب تک فرحت محسوس ہوتی ہے۔

میر ضمیر اور مرزا دبیر سے قبل صنف مرثیہ کو قابل اعتنا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ کوئی تصور نہیں کرسکتا تھا کہ اس میدان میں اتنی وسعت ہوگی کہ مرزا دبیر کی طرح کے فنکار کے خیالات اس صنف میں سما سکتے ہیں۔ عام طور پر مرثیے کو اہل بیت اطہار سے عقیدت کا ذریعہ قرار دیا جاتا تھا اور بس! پھر مذہبی عقائد کی وابستگی کی بنا پر حرف گیری بھی نہیں ہوتی تھی بلکہ منبر پر بیٹھ کر جو کچھ مرثیہ گو نے سنایا اسے عقیدت کے کانوں سے سنتے تھے اور زبان طاعت سے داد دیتے تھے۔ مرثیہ ایک صنف سخن ضرور تھی مگر اس کی حیثیت ایسی تھی کہ جو جس طرح چاہے اس میں دادِ سخن دے سکتا تھا بلکہ مثل مشہور تھی کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو اور بگڑا گویا سوزخوان۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس کے لیے فنی ہیئت متعین نہیں تھی۔ موجودہ صورت میں جہاں تک ہیئت کا تعلق ہے، بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ مرزا دبیر اور ان کے بلند مرتبہ معاصرین کی کاوشیں اردو مرثیے کی ہیئت قرار پائیں۔ جس طرح انھوں نے اسے نظم کیا وہی اس کی ہیئت کہی گئی اور جو خوبیاں انھوں نے اس میں جمع کیں وہی اس صنف کے پرکھنے کا معیار ہوگئیں۔

مرثیے کو ترقی دینے کے عمل میں کچھ آگے چل کر دوسروں نے بھی مرزا دبیر کا ساتھ دیا مگر مرزا دبیر نے اس کی ابتدا کی اور سوچ سمجھ کر کی۔ جس علم کو میر ضمیر نے ہاتھوں میں لے لیا تھا اس کو مرزا دبیر نے اور بلند کر دیا، اس کی آب و تاب اور شان و شوکت میں اضافہ کیا۔ پروفیسر آل احمد سرور کہتے ہیں کہ غالب نے اردو شاعری کو ذہن دیا۔ (۱) ان کی بدولت ایسے خیالات اردو شاعری میں آئے جن میں فکری عنصر زیادہ تھا۔ اس معیار کو سامنے رکھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ میر و سودا نے مرثیہ کا ہیولیٰ تیار کیا۔ میر ضمیر اور میر خلیق نے اس کے پیر تراشے اور مرزا دبیر نے اس کو عالمانہ فکر و نظر، منطقی اظہار اور فنکارانہ نقوش عطا کیے، وہ بھی اس طرح کہ محسوس ہوتا ہے کہ تمام نقوش اس کے اندر سے ابھرے ہیں جن کی وجہ سے یہ صنف دور سے پہچانی جانے لگی اور اس کی ایک انفرادیت قائم ہوگئی۔

مرزا دبیر نے اردو مرثیہ کو تمام اصناف سخن کا سرچشمہ بنا دیا۔ اس میں غزل کے دلگداز جذبات آگئے، مثنوی کا بیانیہ حسن آگیا، قصیدے کا شکوہ اور سطوت آگئی۔ مرزا دبیر نے اپنی نکتہ رس طبیعت سے اس میں جو جوہر پیدا کیے جس نے اردو شاعری کے دامن سے اس داغ کو مٹا دیا جس کی وجہ سے قدما اس سے فرار کر کے فارسی کے سائے میں پناہ لیتے تھے۔ مرزا دبیر کے بلند مرتبت ہونے کی یہی دلیل کافی ہے کہ انھوں نے اردو شاعری کو دل سے دماغ تک کا سفر کرایا۔

مرزا دبیر پہلے اردو مرثیہ گو تھے، جو علوم مشرقیہ پر عالمانہ دسترس رکھتے تھے۔ بات سے بات پیدا کرنا، ہر دعویٰ کے ساتھ دلیل پیش کرنا اور اس دلیل کو اس حد تک پر تاثیر بنا دینا کہ سامعین نہ صرف اس سے قائل ہوجائیں بلکہ اس پر عمل کرنا شروع کر دیں، ان کی فنکاری کا ثبوت ہے۔

کسی زبان کے شعری ادب کی قدر و قیمت کا اندازہ دو باتوں سے کیا جاتا ہے کہ اس میں کیا کہا گیا ہے اور کیسے کہا گیا ہے۔ اگر شعر نثر ہوجائے تو اس میں شعریت کم ہوجاتی ہے اور اگر اس میں خیال نہ ہو یا خیال میں عامیانہ پن ہو تو شاعری بنجر زمین کی طرح سے ہوجائے گی جس میں لاکھ ہل چلایئے، بیج بویئے، سینچیے مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوگا۔ اگر اس میں وہی پھل ہے جو آپ کو ہر زبان میں ملے تو اس سے بھی اس کی توقیر کچھ زیادہ بلند نہیں ہوتی۔

مرزا دبیر نے اپنی صلاحیتوں سے اردو زبان کو اس قدر مالا مال کر دیا کہ اس میں زرخیزی بھی آگئی اور دوسروں کو اس کا احساس بھی ہوگیا۔ ان کے دور میں فارسی زبان کا بول بالا تھا۔ علمی تبحر معیار قرار دیا جاتا تھا لیکن مرزا دبیر نے باوجود اس کے کہ فارسی میں زبردست شاعرانہ صلاحیت رکھتے تھے، اردو کو اپنے اظہار کمال کا ذریعہ بنایا اور اس کو اس قابل بنایا کہ اس کا قد فارسی کے قد کے برابر نظر آنے لگا۔ اس کی حلاوت اور شیرینی بھی اس میں آگئی اور تمکنت و جلال بھی۔

مرزا دبیر سے قبل تک اردو کو ریختہ ہی سمجھا جاتا تھا مگر مرزا دبیر نے عوام و خواص سے منوا لیا کہ اردو کے دامن میں کافی وسعت ہے اور اس میں وہ جواہر موجود ہیں یا پیدا کیے جاسکتے ہیں جو دوسری ترقی یافتہ زبانوں میں پائے جاتے ہیں۔ خاص طور پر اس کو فارسی کا ہم پلہ بنانے میں مرزا دبیر کا بڑا دخل تھا۔ یہ کوئی کرشمہ نہیں تھا کیونکہ فارسی کا جادو اتنا چل چکا تھا کہ نظم تو کیا نثر میں بھی جب اہل علم و دانش کچھ رقم کرنے لگتے تو اردو ذہن سے اتر جاتی تھی اور وہ فارسی کا سہارا لینے لگتے تھے۔ ذاکر حسین فاروقی مرحوم تحریر کرتے ہیں:

''اردو کو فارسی کا ہم پلہ ثابت کرنے کا کارنامہ دبیر ہی نے انجام دیا۔ انھوں نے مدح میں خاقانی و انوری سے ٹکر لی۔ مبالغے میں ظہیر فاریابی کا پہلو دبایا۔ شکوہ الفاظ و طنطنہ بیان میں فردوسی کے کمال کا مظاہرہ کیا، اخلاق و موعظت میں سعدی و رومی کی سنت کی تجدید کی، دقت پسندی و مضمون آفرینی میں صائب و بیدل کا مقابلہ کیا اور ان تمام میدانوں میں اپنی پرواز فکر کے جوہر

دکھائے جواب تک ایرانی سخن آفرینیوں کی جولا نگاہ تصور کیے جاتے تھے۔ مرزا صاحب کی مضمون آفرینیوں، صنائعیوں اور ژرف نگاریوں نے ہمیں پہلی مرتبہ وہ سرمایۂ شعروادب عطا کیا ہے جسے ہم سخن آفریان فارس کے مقابلے میں فخر کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں۔''[2]

مرزا دبیر نے اپنی طرف سے صنف مرثیہ کی آبیاری کی مگر اس صنف میں وہ خوبیاں پیدا ہو گئیں کہ اس کا عکس بعد کے شاعروں میں بھی ملنے لگا او رمعاصرین کا متاثر ہونا تو قدرتی بات تھی۔ یہ ایسی منزل تھی جہاں نہ صرف کسی ایک صنف کا رخ بدل گیا بلکہ پوری زبان پر اس کے اثرات پڑ گئے جو ایسے نتیجہ خیز ثابت ہوئے کہ آج تک باقی ہیں۔

مرزا دبیر کا ادبی مرتبہ اردو شاعروں اور خصوصاً مرثیہ گویوں میں ان کی ان خصوصیات کو سامنے رکھ کر متعین کیا جانا چاہیے جن میں انھیں درجہ اجتہاد حاصل ہے۔ وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اپنی ایجاد پسند طبیعت سے مرثیہ کو مضامین عالی عطا کیے۔ عالم اور فاضل ہونے کی وجہ سے انھوں نے مرثیہ کو عالمانہ تبحر عطا کر کے اسے عزاداری کی مجلسوں سے بلند کر کے عالمانہ غور وفکر کا سامان بنا دیا۔ اس صنف میں انھوں نے فکر کا وہ عنصر شامل کر دیا جس سے مرثیہ تو کیا اردو کی پوری شاعری بے بہرہ تھی۔ مرزا دبیر کا تخیل بہت اعلیٰ تھا اور اس کو بروئے کار لا کر انھوں نے اس صنف کو بین اور ماتم کے تنگ دائرے سے نکالا، اس کو اتنی وسعت دی کہ اس میں دنیا کے تمام واقعات نظم کرنے کی گنجائش پیدا ہو گئی۔

مرزا دبیر کو زبان و بیان پر پوری قدرت تھی۔ وہ الفاظ سے کام لینا جانتے تھے اور الفاظ کو نئے مفہوم بخشنا ان کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ انھوں نے بعض الفاظ اور تراکیب کا استعمال پہلی مرتبہ کرنے کے علاوہ ان کے مفاہیم میں بھی وسعت پیدا کر دی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بڑی چابکدستی سے ان تمام صنائع لفظی کا استعمال کر سکے جو اردو کے کسی شاعر کے ہاں یکجا نہیں ہوئیں۔

مرزا دبیر خود اپنے اندر ایک دبستان رکھتے تھے۔ انھوں نے نہ صرف اردو مرثیہ کی نئی روایت قائم کی بلکہ خود ایک روایت ہو گئے اور اس روایت کی حفاظت عمر بھر کرتے رہے۔ اس کو عام کرنے میں انھوں نے کبھی بخل سے کام نہیں لیا اور اسے دوسروں تک پہنچاتے رہے۔ عام طور پر شاعر کو شہرت کمال اس وقت حاصل ہوتی ہے جب وہ خود فنا ہو جاتا ہے مگر مرزا دبیر نے نوجوانی کے زمانے میں اتنی شہرت حاصل کر لی تھی کہ لوگ ان کی زندگی میں ان کو استاد فن سمجھتے تھے اور کافی تعداد میں لوگ ان کی شاگردی میں آئے جو ان کے بعد بھی اس فیض کو دوسروں تک پہنچاتے رہے۔ 32 برس کی عمر تک پہنچنے سے پہلے ہی مرزا دبیر شاعروں میں استاد بالیاقت مشہور تھے۔ میر حسین علی تاسف نے اکثر اساتذہ کے خلاف لکھا ہے لیکن مرزا دبیر کے قدرداں تھے۔ وہ اپنے دیوان صد غزل میں میر محمد حسن کی ایک غیر مطبوعہ مثنوی کے قطعہ تاریخ میں کہتے ہیں:

شاگرد بھی نہ کیونکر عالم میں ہو سخنور
استاد بالیاقت جس کا دبیر ہووے[3]

مرزا دبیر کے شاگردوں نے بعد میں اساتذہ کا مرتبہ حاصل کیا۔ مرزا محمد جعفر اوج، منیر شکوہ آبادی، صفیر بلگرامی، شاد عظیم آبادی، شیخ فقیر حسین عظیم، میر بادشاہ علی بقا، حکیم سید محمد علی قدیر، شیخ گوہر علی مشیر، میر واجد علی تسخیر، مرزا محمد تقی خاں اختر، شیخ امداد علی عشیر، میر اولاد حسین قوی، سید کاظم حسین تنویر وغیرہ مرزا دبیر کے شاگرد ہوئے۔ بلاواسطہ اور بالواسطہ شاگردوں کی تعداد شمار میں نہیں لائی جا سکتی۔ مرزا دبیر ایک مکمل دبستان مرثیہ گوئی کے رہنما کا درجہ رکھتے ہیں۔ ذاکر حسین فاروقی مرحوم کا مقالہ ''دبستان دبیر'' شاگردوں کے ہی ذکر پر مبنی ہے۔

حواشی:

1. نقد غالب ص 124 مرتبہ مختار الدین آرزو۔ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ 1956
2. دبستان دبیر ص 154
3. تحقیقی نوادر، ص 157

□□□

مرزا سلامت علی دبیر: حیات اور کارنامے

مصنف: مرزا محمد زماں آزردہ

مرزا سلامت علی دبیر انیسویں صدی کے ان شعرا میں سے ہیں جنھوں نے مرثیہ گوئی کو ایک نئی تب وتاب عطا کی اور ایک منفرد لب و لہجے سے ہم کنار کیا۔ ان پر ابھی تک جو کچھ بھی تحقیقی مواد فراہم ہوسکا ہے وہ بڑی حد تک تشنہ ہے۔ اس کتاب میں دبیر کے حالات زندگی، شعری کارنامے، مراثی کی روایت، کلام دبیر کی اہم خصوصیات، ان کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کی نشاندہی اور ان کے ادبی مرتبے کے تعین کے ذریعے اس تشنگی کو دور کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

صفحات: 592، قیمت: -/258 روپے

توزک جہانگیری سے ماخوذ **(ہماری مطبوعات سے)**

زعفران کے پھول

یکشنبہ 26 جمادی الاول پرویز کی اور شاہزادہ مراد کی بیٹی کی شادی کی تقریب ہوئی۔ رسم شادی حضرت مریم زمانی کے گھر پر ہوئی۔ جشن وطوئی[1] پرویز کے مکان پر ہوا اور وہاں جو لوگ موجود تھے ہر طرح کے اعزاز و نوازشات سے مشرف ہوئے۔ نو ہزار روپے شریف آملی اور دوسرے امرا کے حوالے کیے گئے کہ فقرا اور غربا میں تقسیم کر دیے جائیں۔

یکشنبہ 10 رجب کو میں شہر سے باہر گرجھاک اور نندنہ[2] شکار کے ارادے سے باہر نکلا اور رام داس کے باغ میں قیام پذیر ہوا جہاں میں چار دنوں تک مقیم رہا۔

13 تاریخ بروز چہار شنبہ، پرویز کی وزن شمسی کی گئی۔ لوگوں نے اسے بارہ بار مختلف قسم کی دھاتوں اور چیزوں میں تولا۔ ہر بار اس کا وزن دو من اور 18 سیر نکلا۔ میں نے حکم دیا کہ تمام چیزوں کو فقرا میں تقسیم کر دیا جائے۔ اس وقت شجاعت خاں کا منصب اصل سے اضافہ کر کے 1500 ذات اور 700 سوار کر دیا گیا۔

مرزا غازی اور اس کی فوج کے کوچ کرنے کے بعد مجھے خیال آیا کہ ایک دوسری امدادی فوج بھی بھیجنی چاہیے۔ بہادر خاں قوربیگی[3] کو اس کے اصل منصب میں اضافہ کر کے 1,500 ذات اور 800 سوار کا منصب دیا گیا۔ میں نے سواروں[4] کی ایک ٹکڑی روانہ کی جس میں تین ہزار افراد تھے اور جس کی قیادت شاہ بیگ اور محمد امین کر رہے تھے۔ اس فوج کے اخراجات کے لیے دو لاکھ روپے دیے گئے اور 1,000 برق انداز بھی مقرر کیے گئے۔

میں نے آصف خاں کو خسرو کی نگرانی اور لاہور کی حفاظت کے لیے چھوڑا۔ امیر الامرا کو میرے حضور میں حاضری سے محروم کر دیا گیا تھا۔ وہ سخت بیمار تھا اور شہر میں مقیم تھا۔ عبدالرزاق ماموری کو جسے رانا کے ملک سے طلب کیا گیا تھا، ترقی دی گئی اور بخشی گیری حضور مقرر کیا گیا۔ حکم دیا گیا کہ ابوالحسن کے ساتھ وہ یہ خدمت مستقل طور پر انجام دے۔

اپنے والد کی رسم کے تحت میں دو آدمیوں کو ایک دوسرے کی شراکت میں اہم عہدوں پر فائز کرتا ہوں۔ یہ اس لیے نہیں کہ ان پر اعتماد نہیں بلکہ اس لیے کہ بہر حال وہ بشر ہیں اور کوئی بھی آدمی بیماری اور حادثات سے مبرا نہیں ہے۔ اگر کوئی کسی پریشانی یا کسی مشکل کا شکار ہو جائے تو دوسرا کام سنبھال لے اور بندگان خدا تباہی کا شکار نہ ہوں۔

اس وقت خبر ملی کہ دسہرے کے دن جو ہندوؤں کا ایک مقررہ تہوار ہے، عبداللہ خاں نے کالپی سے جو اس کی جاگیر ہے، اچانک بندیلہ صوبے پر حملہ کر کے کمال بہادری سے رام چند ولد مدھوکر کو، جو عرصۂ دراز سے اس علاقے کو بدامنی کا مرکز بنائے ہوئے تھا، قید کر لیا اور اسے کالپی لے آیا ہے۔ اس خدمت کے لیے اسے علم اور منصب میں اضافہ کر کے 3,000 ذات اور 2,000 سوار کر دیا گیا۔

صوبۂ بہار سے عرض داشت موصول ہوئی کہ جہانگیر قلی خاں کی سنگرام سے، جو بہار کا ایک بڑا زمیندار ہے، جنگ ہوئی۔ سنگرام کے پاس 4,000 سوار اور ان گنت پیدل سپاہی تھے۔ بعض مخالفتوں (ص۔83) اور ناوفاداریوں کے سبب اس ناہموار زمین اور میدان جنگ میں، مذکورہ خان نے اپنی مردانہ وار کوشش کی۔ آخر میں سنگرام گولی لگنے سے ہلاک ہو گیا اور اس کے بہت سے آدمی میدان جنگ میں کام آئے اور جو بچ گئے تھے وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ چونکہ یہ نمایاں کام جہانگیر قلی خاں نے انجام دیا تھا میں نے اسے ترقی دے کر 4,500 ذات اور 3,500 سوار کے منصب پر فائز کر دیا۔

تین ماہ اور چھ دن شکار میں گزرے۔ 581 جانور بذریعۂ بندوق، شکاری تیندوے، اور ایک قمرگاہ[5] کے جال میں پکڑے گئے۔ ان میں سے 158 جانور میری بندوق سے ہلاک ہوئے۔ قمرگاہ دوبارہ کیا گیا۔ ایک موقعے پر ایک گرجھاک میں، عورتوں کی موجودگی میں، 155 جانور شکار کیے گئے اور دوسری بار، ندینہ میں 110[6] جانور جو شکار کیے گئے اس کی تفصیل یوں ہے۔ پہاڑی بھیڑیں 180، پہاڑی بکریاں 29، جنگلی گدھے 10، نیل گائے 9،

"توزک جہانگیری" (جلد اول) سے ماخوذ، انگریزی ترجمہ: الیکزینڈر راجرس (آئی سی ایس)،
حاشیے اور ایڈیٹنگ: ہنری بیورج (آئی سی ایس)، اردو ترجمہ: اقبال حسین، صفحات۔ 460، قیمت: -/165

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب %45 اور %40 کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔

ہرن وغیرہ 348۔

چہار شنبہ، 16 شوال کو میں شکار سے بخیر لوٹا۔ جب ایک پہر چھ گھڑیاں گزر چکی تھیں میں مذکورہ دن لاہور میں داخل ہوا۔ چندوالہ کے مقام پر، ایک چھوٹا مینار قائم کیا گیا تھا میں نے ایک سیاہ ہرن کے پیٹ(7) پر گولی داغی، جب وہ زخمی ہوا تو اس سے ایسی آواز نکلی جو میں نے پہلے کسی ہرن سے غیر مستی کے زمانے میں نہیں سنی تھی۔ پرانے شکاری اور وہ جو میرے ساتھ تھے حیرت میں پڑ گئے اور بولے کہ انھیں یاد نہیں اور نہ ہی اپنے بزرگوں سے سنا کہ اس طرح کی آواز ہرن سے مستی کے زمانے کے علاوہ نکلتی ہو۔ یہ اس لیے لکھا گیا ہے کہ یہ بات بہت حیرت ناک ہے۔ میں نے پہاڑی بکرے کا گوشت دوسرے جنگلی جانوروں کے مقابلے میں زیادہ ذائقہ دار پایا، گوکہ اس کی کھال کی مہک بہت بری ہے یہاں تک کہ جب اسے پکایا جاتا ہے تب بھی اس کی مہک ضائع نہیں ہوتی۔ میں نے حکم دیا کہ جو سب سے بڑا بکرا ہو اس کا وزن کیا جائے، یہ دو من اور چوبیس سیر کا تھا جو ولایت کے من کے مطابق 21 من (ص، 84) کے برابر تھا۔ میں نے حکم دیا کہ بڑا مینڈھا وزن کیا جائے یہ دو من سولہ سیر پایا گیا جو 76 ایرانی من کے برابر ہے۔ میں نے شکاریوں اور ان لوگوں سے جن کو شکار کا شوق ہے کئی بار سنا ہے کہ پہاڑی مینڈھے کے سینگ میں ایک خاص موقعہ پر ایک کیڑا پیدا ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ چڑچڑے پن کا شکار ہو جاتا ہے جو اسے مادہ بھیڑ کی طرف لڑنے کو متوجہ کرتا ہے اور یہ کہ جب وہ اپنا کوئی مقابل نہیں پاتا تو وہ اپنا سر درخت یا چٹان سے ٹکرا کر اپنی کوفت کو دور کرتا ہے۔ دریافت کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ اسی طرح کا کیڑہ مادہ بھیڑ کی سینگ میں بھی پیدا ہوتا ہے اور چونکہ مادہ لڑتی نہیں ہے، یہ بیان صاف طور سے غلط معلوم دیتا ہے۔ گوکہ جنگلی گدھے کا گوشت حلال ہے اور بہت سے لوگ کھانا پسند کرتے ہیں۔ یہ مجھے کسی طرح بھی اچھا نہیں لگا۔

چونکہ اس سے پہلے دلیپ سنگھ اور اس کے والد رائے سنگھ کو سزا کا حکم دیا گیا تھا، خبر ملی کہ زاہد خاں پسر صادق خاں، عبدالرحیم پسر شیخ ابوالفضل، راناشنکر اور معزالملک نے منصب داروں کی ایک دوسری فوج اور دربار کے مریدوں نے دلیپ سنگھ کے متعلق خبر سنی کہ وہ ناگور کے قرب وجوار میں جو صوبہ اجمیر میں ہے، موجود ہے وہ لوگ ادھر بڑھے اور اسے جالیا چونکہ اس کے پاس فرار کی کوئی راہ نہیں تھی مجبوراً اس نے ثابت قدمی سے شاہی فوج کا مقابلہ کیا۔ مختصر جھڑپ کے بعد اسے شکست ہوئی اور اس کے بہت سے ساتھی مارے گئے اور وہ خود اپنا اسباب لے کر تباہی کے غار میں پہنچ گیا۔

شکستہ صلاح و گستہ کمر
نہ یارائے جنگ و نہ پروائے سر

(ترجمہ) ٹوٹے بازوؤں اور ڈھیلی کمر کے ساتھ کوئی لڑنے کی قوت نہیں رکھ سکتا اور نہ ہی سر بچا سکتا ہے۔

عمر کی زیادتی کے باوجود میں نے قلیج خاں کو اس کے منصب پر برقرار رکھا کیونکہ اس نے میرے والد کی خدمت کی تھی۔ میں نے حکم دیا کہ سرکار کالپی میں اسے جاگیر دی جائے۔

ذی قعدہ کے ماہ میں، قطب الدین خاں کوکہ کی والدہ جنھوں نے مجھے دودھ پلایا تھا اور جو میرے لیے ماں کی طرح تھیں بلکہ میری ماں سے بھی زیادہ مہربان تھیں اور جن کی آغوش میں میں نے بچپن میں پرورش پائی تھی اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ میں نے ان کے جنازہ کو کچھ دور تک کاندھا دیا۔ بہت زیادہ افسوس اور غمزدہ ہونے کے سبب مجھے کئی دنوں تک کھانے کی طرف کوئی رغبت نہیں رہی اور میں نے کئی دنوں تک لباس بھی نہیں تبدیل کیا۔

'جشن نوروز دوئم' از جلوس ہمایوں

چہار شنبہ 22 ذی قعدہ 1015ھ مطابق 10 مارچ 1607 دن کے تین پہر ڈھل جانے کے بعد جب سورج اپنے خانۂ شرف میں داخل ہوا تو محل کو عام دستور کے مطابق سجایا گیا۔ ایک بڑے جشن کا اہتمام کیا گیا اور ایک مبارک ساعت پر میں تخت نشیں ہوا۔ میں نے امرا اور دیگر درباریوں کو مہربانی اور عنایتوں سے سرفراز کیا۔ اسی مبارک دن قندھار سے موصول شدہ ایک خبر سے معلوم ہوا کہ جو فوج مرزا غازی پسر مرزا جانی کی قیادت میں بھیجی گئی تھی تاکہ وہ شاہ بیگ کی مدد کر سکے، 12 شوال کو قندھار میں داخل ہوگئی۔ جب ایرانیوں کو فاتح فوج کی خبر شہر کی آخری منزل کے قریب آجانے کی ملی تو ان کو تعجب ہوا اور وہ سراسیمہ، پریشان و شرمندہ ہوکر بھاگ کھڑے ہوئے اور اس وقت تک نہیں رکے جب تک بلند نہیں پہنچ گئے جو پچاس یا ساٹھ کوس کے فاصلے پر واقع ہے۔

دوسری بات یہ ظاہر ہوئی کہ فرح کے صوبہ دار اور اس علاقے کے بہت سے دوسرے حاکم سوچ رہے تھے کہ مرحوم بادشاہ کے بعد ابتری کا فائدہ اٹھا کر وہ قندھار پر بہ آسانی قبضہ حاصل کرلیں گے اور شاہ عباس سے کسی حکم کا انتظار کیے بغیر یہ اکٹھا ہوگئے اور سیوستان کے ملک کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ کسی شخص کو، حسین خاں صوبہ دار ہرات کے پاس بھیج کر اس سے مدد مانگی۔ اس نے بھی ایک فوج بھیجی۔ اس کے بعد انھوں نے قندھار پر حملہ کردیا۔ شاہ بیگ خاں جو وہاں کا صوبہ دار تھا یہ دیکھ کر کہ جنگ کے دوسر(8) ہیں اور اگر خدانخواستہ اس کی شکست ہوگئی تو قندھار سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ یہ سوچ کر اس نے محصور ہونے کے بجائے کھلی جنگ کو ترجیح دی۔ اس نے یہ سوچ کر قلعے میں رہنے کو ترجیح دی اور دربار کو تیز رفتار قاصد بھیجا۔ اتفاق سے اس وقت میں آگرہ سے خسرو کے تعاقب میں نکل چکا تھا اور لاہور میں تھا۔ اس خبر کے سننے کے فوراً بعد (شاہ بیگ خاں سے) امرا و منصبداروں کی ایک بڑی فوج، مرزا غازی کی رہنمائی

میں بھیجی گئی۔ قبل اس کے کہ مرزا قندھار پہنچے، شاہ ایران کو یہ اطلاع ملی کہ صوبہ دار فرح اس علاقے کے کچھ جاگیرداروں کے ساتھ صوبۂ قندھار کی طرف کوچ کر گیا ہے۔ یہ خیال کر کے یہ ایک ناواجب قدم ہے اس نے حسین بیگ کو جو ایک معروف اور اس کا قریبی آدمی تھا، تفتیش کے لیے بھیجا۔ اس نے ان لوگوں کے نام ایک فرمان بھی جاری کیا کہ وہ لوگ قندھار کے قلعے کے پاس سے ہٹ جائیں اور اپنے اپنے ٹھکانوں پر لوٹ جائیں کیونکہ ان کے اجداد کی دوستی اور موالات جہانگیر بادشاہ کے خاندان سے قدیم ہیں۔ اس فوج نے حسین بیگ کی آمد اور فرمان کے ملنے سے پہلے ہی شاہی فوج کے مقابلے میں تاب مقاومت نہ لانے کی وجہ سے لوٹ جانا ہی مناسب سمجھا۔ حسین بیگ مذکور نے ان لوگوں کی ملامت کی اور مجھ سے ملاقات کے لیے چل پڑا جس کی سعادت اسے لاہور میں حاصل ہوئی۔ اس نے بتلایا کہ بدقسمت فوج جس نے قندھار پر حملہ کیا تھا، شاہ عباس کی اجازت کے بغیر حرکت میں آئی تھی۔ اس نے کہا خدانخواستہ اس واقعے کے نتیجے میں میرے دل میں کوئی ناخوشگواری باقی نہ رہے۔ المختصر فاتح فوج قندھار پہنچی۔ اس نے حکم کے مطابق قلعے کو سردار خاں کے حوالے کیا اور شاہ بیگ خاں امدادی فوج کے ہمراہ دربار میں حاضر ہوا۔

27 ذی قعدہ کو عبداللہ خاں نے رام چند بندیلہ کو قید کر کے پابجولاں میرے سامنے پیش کیا۔ میں نے حکم دیا کہ اس کے پاؤں کی بیڑیاں ہٹا دی جائیں۔ اسے خلعت عطا کی اور راجہ باسو کے حوالے کر دیا تاکہ وہ اس کی ضمانت لے کر اسے اور اس کے دوسرے گرفتار ساتھیوں کو رہا کر دے۔ یہ میری مہربانی اور معافی کی وجہ سے ہوا۔ اسے ایسی معافی اور مہربانی کا تصور بھی نہیں تھا جو میں نے کی۔

2 ذی الحجہ کو میں نے اپنے فرزند خرم کو ایک تومان اور طوغ، علم اور نقارہ عطا کر کے 8,000 ذات اور 5,000 سوار کا منصب عطا کیا۔ میں نے حکم دیا کہ اسے ایک جاگیر دی جائے۔ اسی روز پیر خاں پسر دولت خاں لودی کو جو دانیال کے بچوں کے ساتھ خاندیس سے آیا تھا، 3,000 ذات اور 1,500 سوار کے منصب سے اور صلابت خاں کے خطاب سے سرفراز کیا اور اسے علم اور نقارہ بھی عطا کیا۔ میں نے اسے اپنی فرزندی کے لقب سے بھی سرفراز کیا جو اس کے ساتھیوں اور برابر والوں کو حاصل نہیں تھا۔ صلابت خاں کے بزرگ اور چچا کے دادا لودی قبیلے میں بہت معظم اور معزز مانے جاتے تھے۔ چنانچہ سابق دولت خاں، صلابت خاں کے دادا جب ابراہیم (لودی) اپنے والد کے انتقال کے بعد اپنے والد کے زمانے کے امرا سے برا سلوک کرنے لگا تب انھوں نے اپنے چھوٹے بیٹے دلاور خاں کو اعلیٰ حضرت بابر کے حضور میں کابل بھیجا اور انھیں ہندوستان کی تسخیر کا مشورہ دیا۔ چونکہ بابر بھی ایسا ہی منصوبہ بنا رہے تھے وہ فوراً اس طرف روانہ ہو گئے اور اس وقت تک نہیں رکے جب تک کہ لاہور کے قریب و جوار میں نہیں پہنچ گئے۔ دولت خاں اپنے ساتھیوں کے ساتھ ان کی (بابر) کی خدمت میں حاضر ہوا اور وفاداری کے ساتھ خدمات انجام دیں۔ وہ ضعیف آدمی تھا اور ظاہری و باطنی خوبیوں سے آراستہ تھا۔ اس نے بہت اچھی طرح خدمت انجام دی۔ بابر اسے بالعموم پدر (ابا) کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ اسے بدستور پنجاب کی صوبہ داری سونپ دی گئی اور اس کے امرا اور جاگیرداروں کو اس کے زیر نگیں کر دیا۔ بابر دلاور خاں کو لے کر لاہور لوٹ گئے۔ جب وہ دوبارہ پنجاب، ہندوستان پر حملہ کرنے کی نیت سے آئے تو دولت خاں ان کے حضور میں حاضر ہوئے اور اسی دن ان کا انتقال ہو گیا۔ دلاور خاں کو خان خاناں کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔ وہ بابر کے ساتھ جنگ میں شریک تھا جو ابراہیم لودی سے لڑی گئی تھی۔ اسی طرح وہ مستقل طور پر ہمایوں کی خدمت میں رہا۔ بنگال سے ہمایوں کی واپسی کے وقت وہ تھانہ مونگیر میں تھا اور بہادری کے ساتھ شیر خاں (شیر شاہ سوری) سے جنگ آزما ہوا تھا اور میدان جنگ میں ہی گرفتار ہوا تھا۔ گو کہ شیر خاں نے چاہا تھا کہ وہ اس کی ملازمت قبول کر لے، اس نے منظور نہیں کیا اور کہا ''تمھارے اجداد ہمیشہ ہمارے ملازم رہے ہیں میں ایسا کیسے کر سکتا ہوں۔'' شیر خاں کو بہت غصہ آیا اور حکم دیا کہ اسے دیوار میں چن دیا جائے۔

عمر خاں، صلابت خاں فرزند کے دادا، جو دلاور خاں کے چچازاد بھائی تھے، سلیم خاں کے زمانے میں اعزاز کے ساتھ رہے۔ سلیم خاں کی موت کے بعد اور اس کے بیٹے فیروز کی محمد خاں کے ہاتھوں ہلاکت کے بعد عمر خاں اور اس کے بھائی محمد خاں سے شاکی ہو گئے اور گجرات چلے گئے جہاں عمر خاں وفات پا گئے۔ دولت خاں اس کا بیٹا جو ایک شجاع، خوش شکل جوان تھا اور ہر معاملے میں اچھا تھا، عبدالرحیم پسر بیرم خاں کی صحبت اختیار کی جسے اکبر کے عہد میں خان خاناں کے خطاب سے نوازا گیا تھا اور جس نے بیش قیمت خدمات انجام دی تھیں۔ خان خاناں اسے اپنے بھائی کی طرح عزیز رکھتا تھا بلکہ اپنے بھائی کے مقابلے میں اسے ہزار گنا چاہتے تھے۔ خان خاناں کی بہت سی فتوحات، دولت خاں کی شجاعت اور مردانگی[9] کی مرہون منت تھیں۔ جب میرے معزز والد نے ولایت خاندیس اور اسیر کا قلعہ فتح کر لیا تو دانیال کو ان صوبوں کی ذمے داری جو دکن کے حکمرانوں سے حاصل ہوئی تھی، سونپ کر خود آگرہ لوٹ آئے۔ اس وقت دانیال نے دولت خاں کو خان خاناں سے الگ کر دیا اور اپنی خدمت میں رکھ کر حکومت کی باگ ڈور اسے سونپ دی۔ اس نے اس پر بہت مہربانیاں کیں جب تک کہ اس کی ملازمت ہی میں اس کی موت نہیں ہو گئی۔ اس نے دو بیٹے چھوڑے تھے۔ ایک محمد خاں اور دوسرا پیر خاں۔ محمد خاں بڑا تھا

اور اپنے والد کی وفات کے چند دنوں بعد فوت ہوگیا۔ دانیال نے خود کو شراب میں غرق کر دیا۔ اپنی تخت نشینی کے بعد میں نے پیر خاں کو طلب کیا۔ میں نے اس میں جوہر ذاتی اور فطری قابلیت دیکھی، اسے منصب عالی پر فائز کر دیا جس کا ذکر کر چکا ہوں۔[10]

چونکہ میں نے ماوراالنہر کی تسخیر کا ارادہ کرلیا تھا جو ہماری پشتینی بادشاہت تھی، میں نے چاہا تھا کہ ہندوستان سے بغاوت اور فتنہ وفساد دور کر کے اور اپنا ایک بیٹا وہاں چھوڑ کر بذات خود ایک بہادر فوج کے ساتھ جس میں کوہ شکن ہاتھی ہوں، برق رفتاری سے، کافی خزانہ لے کر پوری قوت سے اس ملک کی تسخیر کے لیے جاؤں۔ اس خیال کے تحت میں نے پرویز کو رانا کی سرکوبی کے لیے بھیجا اور خود دکن جانے کا ارادہ کیا۔ بالکل اسی وقت خسرو سے حرکت ناشائستہ سرزد ہوئی اور یہ لازم ہوگیا کہ اس کا تعاقب کیا جائے تاکہ اس کے فتنے کو دفع کیا جا سکے۔ اسی وجہ سے پرویز کی مہم کوئی پسندیدہ صورت نہیں پیدا کر سکی اور مصلحت وقت کے تحت رانا کو مہلت دے دی گئی۔ وہ اس کے ایک بیٹے کو ساتھ لے کر چل پڑا اور لاہور میں میرے پاس حاضر ہونے کی سعادت حاصل کی۔ جب میں خسرو کے فتنے سے بے فکر ہوگیا تب ایرانیوں کے قندھار کے محاصرے کا قضیہ بھی اچھی طرح سے ختم ہو چکا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ اب کابل کی سیر وشکار کے لیے چلنا چاہیے جو میرا وطن مالوف ہے اس کے بعد ہندوستان لوٹوں گا جب میرا مقصد منصوبے کے مطابق پورا ہو جائے گا۔ ان سب باتوں کے پیش نظر 7 ذی الحجہ کو ایک مبارک ساعت میں میں لاہور کے قلعے سے نکلا اور دل آمیز میں مقیم ہوا جو راوی کے دوسرے کنارے پر واقع ہے۔ وہاں میں چار دنوں تک مقیم رہا۔ یکشنبہ 19 فروردین کو جب سورج بام عروج پر تھا میں اس باغ سے نکلا۔ دربار کے چند ملازمین کو ان کے منصب میں اضافہ کر کے سرفراز کیا گیا۔ دس ہزار روپئے حسن بیگ کو عطا کیے گئے جو ایران کے حکمراں کا ایلچی تھا۔ تاج خاں، میران صدر جہاں اور میر شریف آملی کو لاہور میں چھوڑ کر میں نے حکم دیا کہ آپس میں مشورے کے بعد وہ کسی بھی مہم کے معاملے میں فیصلہ لے سکتے ہیں جو درپیش ہو۔ دوشنبہ کو میں نے مذکورہ باغ سے کوچ کیا اور موضع ہر ہر جو شہر سے ساڑھے تین کوس کے فاصلے پر واقع ہے، مقیم ہوا۔ منگل کے دن شاہی لشکر جہانگیر پور میں رکا جو میری ایک مقرر کردہ شکارگاہ ہے۔ میں نے اس کے قریب ایک ہرن منسراج[11] کی قبر کے سرہانے ایک مینار بنوایا تھا۔ منسراج پالتو ہرنوں کی لڑائی اور جنگلی ہرنوں کے شکار میں یکتا تھا۔ ''اس دل کش مقام پر ایک ہرن خدا آگاہ جہانگیر بادشاہ کے دام میں آیا۔ ایک ماہ کے اندر اپنی جنگلی وحشت کو ترک کر کے وہ خاص ہرنوں کا سردار بن گیا۔'' ہرن کی اس خصوصیت کی وجہ سے میں نے حکم دیا کہ اس جنگل[12] میں کوئی بھی ہرن کا شکار نہ کرے اور اس کا گوشت ہندو اور مسلمانوں کے لیے ایسا ہی ہے جیسے گائے اور سور کا۔ قبر کے کتبے کو ہرنی کی شکل کا بنایا گیا تھا۔ میں نے سکندر معین کو جو اس گاؤں کا جاگیردار تھا حکم دیا کہ جہانگیر پور میں ایک مضبوط قلعہ تعمیر کرے۔

جمعرات 14 کو میں چندالہ[13] پرگنہ میں مقیم ہوا۔ اس کے بعد شنبہ 16 تاریخ کو درمیان میں ایک منزل کرنے کے بعد میں حافظ آباد پہنچا[14] میں اس مقام پر رکا تھا جسے وہاں کے کروری میر قیام الدین نے اپنی کوششوں سے تیار کرایا تھا۔ دو کوچ کرنے کے بعد میں 21 ذی الحجہ کو چناب پہنچا۔ میں نے دریا پل سے پار کیا جو وہاں تعمیر کیا گیا تھا اور حوالی گجرات میں مقیم ہوا۔ جس زمانے میں حضرت عرش آشیانی کشمیر گئے تھے دریا کے کنارے ایک قلعہ تعمیر کیا گیا تھا۔ گوجروں کو جو گرد ونواح میں چوری اور رہ زنی کر رہے تھے، لاکر اس قلعے میں آباد کیا گیا۔ چونکہ یہ گوجروں کا مسکن بن گیا تھا، اکبر نے اسے ایک الگ پرگنہ بنادیا اور اسے گجرات کا نام دیا۔ کہا جاتا ہے کہ گوجر ایک ذات ہے جو کسب اور کم کام کرتے ہیں اور دودھ دہی پر گزارا کرتے ہیں۔ جمعہ کو میں خواص پور میں مقیم ہوا جو گجرات سے پانچ کوس کے فاصلے پر واقع ہے۔ اسے خواص خاں نے جو شیر خاں افغان کا غلام تھا قائم کیا تھا۔ درمیان میں دو مقامات پر منزل کرنے کے بعد میں نے بہت (جہلم) کے کنارے قیام کیا۔ اس رات ہوا بہت تیز چلی اور سیاہ بادل نے آسمان کو ڈھک لیا۔ بارش اس قدر تیز تھی کہ معمر آدمیوں کی یادداشت میں ایسی بارش پہلے نہیں ہوئی تھی۔ اس کے بعد اولے پڑے اور ہر اولہ مرغی کے انڈے کے برابر تھا۔ دریا میں سیلاب آجانے اور ہوا کی تندی سے پل ٹوٹ گیا۔ میں نے حرم کی خواتین کے ساتھ بذریعہ کشتی دریا پار کیا۔ چونکہ وہاں کشتیاں کم تھیں میں نے حکم دیا کہ لوگ کشتیوں سے دریا نہ پار کریں دوبارہ پل تعمیر کیا جائے۔ ایک ماہ میں مکمل ہوگیا اور پوری فوج آرام کے ساتھ دریا پار کرگئی۔ جہلم کا منبع کشمیر کا ایک چشمہ ہے جسے ویرناگ کہتے ہیں۔ ہندوستانی زبان میں سانپ کو ناگ کہتے ہیں۔ ظاہر ہے وہاں ایک بڑا سانپ رہا ہوگا۔ میں اپنے والد کے زمانے میں دوبار چشمے کے پاس گیا تھا۔ یہ کشمیر کے شہر سے بیس کوس کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ ایک مثمن نما حوض ہے جو تقریباً بیس گز لمبا اور بیس گز چوڑا ہے۔ اس کے قریب ایک ویران عبادت گاہ کے آثار ہیں بہت سے غاروں اور چٹانوں کو تراش کر کمرے بنے ہیں۔ اس چشمے کا پانی بے حد صاف ہے گو کہ میں اس کی گہرائی کا اندازہ نہیں کر سکا تاہم اگر ایک خشخاش کا دانہ بھی ڈالا جائے تو وہ سطح زمین تک صاف نظر آتا ہے۔ یہاں پر بہت مچھلیاں دیکھی جا سکتی ہیں۔ میں نے سنا تھا کہ اس چشمے کی گہرائی کا ناپنا مشکل ہے اس لیے میں نے حکم دیا کہ ایک رسی کے سرے پر پتھر باندھ کر ڈالا جائے اور جب رسی گز میں ناپی گئی تو یہ بات واضح ہوگئی کہ اس کی گہرائی

ایک آدمی کے قد سے ڈیڑھ گنا سے زیادہ نہیں ہے۔ اپنی تخت نشینی کے بعد میں نے حکم دیا کہ چشمے کے چاروں طرف پتھر نصب کیے جائیں اور ایک باغ تعمیر کیا جائے جس میں ایک نہر ہو اور اس میں مکانات اور محل بنائے جائیں اور اسے ایسا مقام بنا دیا جائے کہ دنیا کے سیاح یہ کہہ سکیں کہ شاید ہی ایسا کوئی اور باغ ہو۔ دریا قصبہ پامپور[15] جو شہر سے دس کوس کے فاصلے پر ہے، پہنچتا ہے تو وسیع ہو جاتا ہے اور کشمیر سے پوری زعفران اسی موضع سے حاصل ہوتی ہے۔ (ص، 93)۔ سالانہ فصل 500 ہندوستانی من کے حساب سے جو ایرانی من کے حساب سے 5,000 ہے، پیدا ہوتی ہے۔ اپنے محترم والد کی حاضری میں زعفران کے موسم کے زمانے میں میں اس مقام پر آیا تھا، زعفران کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ دنیا کے دیگر پودوں میں پہلے شاخیں نکلتی ہیں تب پتے اور پھول۔ برخلاف اس کے جب زعفران کی ڈنڈی، خشک زمین سے چار انگل اونچی ہوتی ہے، اس میں پھول آجاتے ہیں جو سوسنی رنگ کے چار پنکھڑیوں کے ساتھ اور وسط میں چار ریشے نارنجی رنگ کے اس پھول کی طرح اور ایک انگلی کے جوڑ کے برابر ہوتے ہیں۔ یہ زعفران ہوتا ہے۔ زمین پر ہل نہیں چلائے جاتے نہ ہی آبیاری کی جاتی ہے۔ پودے مٹی کے ڈھیلوں کے درمیان اگتے ہیں۔ بعض مقامات پر اس کی زراعت ایک کوس تک ہوتی ہے اور دوسری جگہ آدھے کوس تک۔ یہ دور سے دیکھنے میں بہتر نظر آتا ہے۔ اس کے توڑنے کے وقت ان تمام لوگوں کے سروں میں اس کی تیز خوشبو سے درد[16] ہوتا جاتا ہے۔ گوکہ میں شراب پیتا ہوں اور افیون کھاتا ہوں، مجھے بھی درد سر ہو گیا۔ میں نے ان کشمیریوں سے پوچھا جو ان پھولوں کو توڑنے کے لیے مقرر کیے گئے تھے کہ وہ کیسا محسوس کرتے ہیں تو معلوم ہوا کہ ان کو زندگی بھر درد سر نہیں ہوا۔

ویرناگ کے چشمے کا پانی اور دوسرے چشموں اور نالوں کا پانی دائیں اور بائیں سے دریائے بہت (جہلم) میں ملتا ہے جو شہر کے درمیان سے گزرتا ہے۔ اس کی چوڑائی[17] اکثر مقامات پر ایک تیر کی مار سے زیادہ نہیں ہوگی۔ کوئی اس کا پانی نہیں پیتا کیونکہ یہ بہت ثقیل اور غیر ہاضم ہے۔ کشمیر کے تمام لوگ ڈل جھیل کا پانی پیتے ہیں جو شہر سے قریب ہے۔ دریائے بہت (جہلم) اس جھیل سے گزرتا ہوا بارہ مولہ درہ، پکلی اور دنتور ہوکر پنجاب میں داخل ہوتا ہے۔

حواشی:

1. توئی کا معرب ہے جس کے معنی شادی، عروسی، جشن، خوشی یا خوشی کا صلہ جو بہ تقریب نکاح ہو۔
2. نندن پور، یہ مقام سندھ ساگر، ملتان کے قریب ہے۔
3. مخطوطہ ص-181 پر بہار، ملتا ہے اور 800 سوار کے بجائے 600 سوار لکھا ہے۔
4. متن میں یماق پوری اور مخطوطہ میں پوری ہے جس کے معنی ایک ہی معلوم دیتے ہیں۔ کیا اس کا مطلب سرخ گھوڑ سواروں، سے ہے؟ جیسا کہ بلاک مین نے توجہ دلائی ہے (ص، 371) دیماق کا مطلب ہر جگہ قبیلہ نہیں ہوتا بلکہ بہتر قسم کے سواروں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔
5. ہندوستانی ''ہانکا'' اس میں چاروں طرف سے جانور کو گھیر کر شکار کیا جاتا ہے۔
6. قمرگاہ یا Ring Hunt کے ذریعے 265 شکار ہوئے بقیہ دوسرے اوقات میں گولیوں کا نشانہ بنے۔ جملہ شکار کا میزان بظاہر 476 ہونا چاہیے۔
7. متن میں'' تفنگ در شکم آہو زدم'' ہے۔
8. متن میں جنگ ''دو سر دارد'' ہے جس کا ترجمہ راجرس نے The Battle has two heads کیا ہے۔ یعنی جنگ مشکل ہے۔ (مترجم)
9. جہانگیر خان خاناں کو پسند نہیں کرتا تھا اس لیے یہاں اسے اس انداز میں پیش کیا ہے۔
10. شاہ جہاں کے عہد میں، خان جہاں لودی (پیر خاں) دربار سے فرار ہو گیا تھا، اس کا تعاقب کیا گیا اور مار ڈالا گیا۔
11. شاید ہرن کا نام راج تھا اور لفظ ''من'' (میرا) یعنی میرا ہرن راج۔ ملاحظہ ہو ایلیٹ جلد ششم، ص 302 اور مخطوطہ نمبر 24 (رائل ایشیاٹک سوسائٹی)
12. متن میں جنگل ہے، راجرس نے ترجمہ Plain یعنی میدان کیا ہے۔ (مترجم)
13. غالباً جندیالا۔ امپیریل گزیٹر، جلد ششم، ص-137
14. انڈین گزیٹیر، جلد پنجم، ص-239
15. متن میں پم پور ہے
16. راجرس کے ترجمہ میں My Attendants got headache ہے، (مترجم)
17. 'از تنگہ اندازی' راجرس سے ایک نیزے کی مار کی دوری ترجمہ کرتا ہے (مترجم)

□□□

تنقیدی اور تہذیبی مطالعے

مصنفہ: طاہرہ پروین

اس کتاب میں اردو شعر و ادب اور خصوصاً نظیر، انیس، اقبال اور رشید جہاں کے حوالے سے ان کی تخلیقات میں مذہبی و تہذیبی امور پر پندرہ مضامین شامل ہیں جن میں مصنفہ نے مذکورہ قلم کاروں کی تخلیقات کو سمجھنے کے لیے لفظیات کی تدریس اور عملی تنقید کا بھی سہارا لیا ہے۔

صفحات: 191، قیمت-/93روپے

اردو خبرنامہ

امیر خسرو کی بازیافت

● نئی دہلی۔ 18 اکتوبر، حضرت امیر خسرو کی بازیافت ضروری ہے کیونکہ وہ عظیم صوفی شاعر اور سیکولر روایات کے علمبردار ہیں۔ ان کی خدمات اور حب الوطنی کا اعتراف کرتے ہوئے حکومت ہند کو بھی اس پر خاص توجہ دیتے ہوئے ان کی ایک شاندار یادگار قائم کرنی چاہیے۔ حکومت سے یہ مطالبہ آئی سی سی آر کے وائس چیئرمین سید شاہد مہدی نے کیا۔ وہ خواجہ ہال میں ''حضرت امیر خسرو: حیات وکمالات'' کے موضوع پر منعقدہ سیمینار میں اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔ سیمینار کا انعقاد خواجہ حسن نظامی میموریل سوسائٹی کی جانب سے امیر خسرو کے 705 ویں عرس کی تقریبات کے تحت کیا گیا۔ سید شاہد مہدی نے امیر خسرو کو کمپوزٹ کلچر کا عظیم مینارہ قرار دیتے ہوئے ان کی علمی وراثت کی بازیافت کی ضرورت پر زور دیا اور کہا کہ امیر خسرو کے نام پر دہلی میں ان کے شایان شان ایک یادگار قائم کی جانی چاہیے۔ سیمینار کی نظامت درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے سجادہ نشین خواجہ حسن ثانی نظامی نے کی۔ انھوں نے دوران نظامت امیر خسرو کی مختلف خصوصیات کو تہذیبی تناظر میں اجاگر کیا۔ پروفیسر اختر الواسع نے ''دل اور دنیا کا پرنور توازن'' کے عنوان سے اپنے مقالے میں امیر خسرو کی عبقری شخصیت کی گوناگوں صفات کے حوالے سے کہا کہ عہد وسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ میں بڑے بڑوں کے نام ونشان مٹ گئے لیکن امیر خسرو آج بھی انسانی ذہنوں میں زندہ ہیں۔ انھوں نے امیر خسرو کی شاعری کے پیغام کی عصری معنویت کو سمجھنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت پر زور دیا۔ پروفیسر شریف حسین قاسمی نے ''خسرو کی مثنوی قران السعدین'' کی غیر معمولی تاریخی اہمیت پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ پروفیسر سید عزیز الدین ہمدانی نے ''حضرت امیر خسرو اور سلطان علاء الدین خلجی'' کے موضوع پر مقالہ پیش کیا جس میں انھوں نے خلجی کے عہد میں علم وفن کو حاصل ہونے والے فروغ پر روشنی ڈالی۔ گلزار دہلوی، متین امروہوی اور افضل منگلوری نے امیر خسرو کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ اس موقع پر سید پیر پاشا نظامی، پروفیسر ریاض عمر، صاحبزادہ سید سلطان چشتی گدی نشین اجمیر شریف، اجمل فاروقی، شجاع خاور، رمیش شرما، انجم عثمانی، ظہیر برنی، ڈاکٹر عقیل احمد، حسین ماجد، شمیم عثمانی، افتخار الزماں، ممتاز عالم، انوار احمد نور سمیت مختلف سرکردہ شخصیات موجود تھیں۔ سیمینار کے بعد لنگر اور اقبال احمد نظامی اور ہمنواؤں کے ذریعے قوالیاں پیش کی گئیں۔ (اخبار مشرق، دہلی)

مولانا محمد باقر پر سمپوزیم

● نئی دہلی۔ 17 ستمبر، المصطفیٰ انٹرنیشنل یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اشتراک سے مجاہد آزادی مولوی محمد باقر کے یوم شہادت پر ایک سمپوزیم کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقع پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے فیکلٹی آف ہیومنٹیز اینڈ لنگویجز کے ڈین پروفیسر عزیز الدین نے کہا کہ مولوی محمد باقر دہلی اردو اخبار کے ایڈیٹر تھے۔ مولوی باقر کو 1857 میں گرفتار کیا گیا۔ بعد میں قتل کر دیے گئے۔ مولوی باقر نے کئی امام باڑے بھی تعمیر کرائے۔ میں نے خود دہلی کے 2 گورنروں کو لکھا تھا لیکن کوئی یادگار نہیں بنی مولانا آزاد میڈیکل کالج بنانے کے لیے وہ یادگار جیل ڈھادی گئی جس میں انھیں ہی نہیں کئی اور مجاہدین آزادی کو پھانسی پر چڑھایا گیا تھا۔ شعبہ ہندی کے عبدل بسم اللہ نے کہا کہ 1857 کا وہ زمانہ تھا جبکہ ہندی اردو اخبارات انگریزوں کے خلاف نبرد آزما تھے حالانکہ ہندی میں اس وقت کم اخبارات تھے مگر اردو میں بہت سارے اخبارات و رسائل نکل رہے تھے بلکہ کئی تو 2 زبانوں میں نکلتے تھے دہلی اردو اخبار کو خاص اہمیت حاصل تھی اس کا رول بے حد اہم تھا جب 5 ستمبر 1857 (ان کے انتقال سے 10 روز قبل) انگریزوں کی طرف سے مسلمانوں سے جہاد کو کہا گیا تو ایک اشتہار کے ذریعے اس کے خلاف مولوی باقر اٹھ کھڑے ہوئے۔ المصطفیٰ یونیورسٹی کے نمائندہ ڈاکٹر غلام رضا مہدوی نے کہا کہ انھوں نے استعماری طاقت سے مقابلہ کیا جوان نسل کو ایسی شخصیات کے سلسلے میں جاننا چاہیے جو ہمارے لیے سبق آموز ہیں ایران و ہند کے مابین ثقافتی رشتے ہیں ایسے افراد، جامعۃ المصطفیٰ عالمی پیمانے پر ایک تحریک ہے ہم 60 سے زائد ممالک میں کام کر رہے ہیں۔ پروفیسر وشوجیت داس نے کہا کہ وقت آگیا ہے کہ ہم مولانا کے مقام کو طے کریں اور ان کے بارے میں جانیں کلچرل کونسلر ڈاکٹر کریم نجفی نے کہا کہ وہ مجاہد آزادی تھے وہ ہمدان سے آئے تھے۔ دہلی کالج میں فارسی پڑھاتے تھے دہلی میں عزائے حسین بپا کرتے تھے۔ اقوام متحدہ کے صدر دروازے پر شیخ سعدی کے جو اشعار کندہ ہیں وہ مولانا نے اپنے اخبار میں 1857 میں چھاپے تھے۔ پروگرام کا آغاز افضال احمد نے تلاوت کلام پاک سے کیا نظامت کے فرائض پروفیسر عزیز الدین حسین نے انجام دیے۔ اس موقع پر مسٹر اثل نوریہ، رضوان قیصر نے بھی خطاب کیا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

بہار کے ہر اسکول میں اردو استاد کی تقرری کا وعدہ

● پٹنہ۔ 18 اکتوبر، بہار کے وزیر اعلیٰ جناب نتیش کمار نے یقین دہانی کرائی ہے کہ بہار کے ہر اسکول میں ایک اردو استاد کا تقرر کیا جائے گا تاکہ ان سبھی طلبہ کو جو اردو پڑھنا چاہیں، اردو پڑھائی جاسکے۔ ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی کہا کہ اردو استاد میں دوسرے مضامین پڑھانے کی اہلیت بھی ہونی چاہیے تاکہ اردو طلبہ کی حاضری پوری نہ ہونے کی صورت میں وہ دوسرے مضامین پڑھا سکے۔ انھوں نے پرنسپل سکریٹری، کیبنٹ سکریٹریٹ گریش کمار کو اس سلسلے میں پروپوزل تیار کرنے کی ہدایت دی۔

وزیر اعلیٰ نتیش کمار پٹنہ میں کیبنٹ سکریٹریٹ کی طرف سے ''اردو زبان اور قومی یک جہتی'' کے موضوع پر منعقدہ سیمینار سے خطاب کر رہے تھے جس میں مغربی بنگال سے راجیہ سبھا کے رکن جناب احمد سعید ملیح آبادی نے ان سے یہ گزارش کی تھی۔ جناب احمد سعید ملیح آبادی نے اپنی تقریر میں بہار میں سرکاری طور پر اردو کو دوسری ریاستی زبان کا درجہ دیے جانے کی تحسین کرتے ہوئے یہ مطالبہ پیش کیا جس کو وزیر اعلیٰ نے فوراً ہی مان لیا۔

اردو ایڈوائزری کمیٹی بہار کے چیئرمین اور مشہور شاعر پدم شری کلیم عاجز نے وزیر اعلیٰ سے درخواست کی کہ وہ اردو زبان کے فروغ پر بھی اسی طرح توجہ دیں جس طرح ہندی کے فروغ پر دی جارہی ہے کیونکہ یہ دونوں زبانیں ایک دوسرے کی سگی ساتھی اور مددگار ہیں۔

قومی اردو کونسل نئی دہلی کے وائس چیئرمین جناب چندر بھان خیال نے کہا کہ اردو کی ترویج و ترقی اس لیے بھی ضروری ہے کہ یہ مذہبی اور تہذیبی ہم آہنگی اور قومی یک جہتی کے جذبے کو بڑھاوا دینے والی زبان ہے اور استخلاص وطن کی تحریک میں بھی اس نے مؤثر رول ادا کیا ہے۔ انھوں نے اردو کا رسم الخط بدلنے کی سخت مخالفت کی اور کہا کہ یہ ایسا ہے جیسے کسی کے جسم کی کھال اتار دی جائے اور اس پر دوسری کھال چڑھانے کی کوشش کی جائے۔

(ہندوستان ٹائمز، پٹنہ)

سینئر قلم کاروں کے ماہانہ وظیفے میں تین ہزار کا اضافہ

● نئی دہلی۔ 30 ستمبر، قمر رئیس نے جو بھی فیصلے لیے تھے ان پر عمل کیا جائے گا اور انھوں نے جو ایوارڈ طے کیے تھے وہ تقسیم کیے جائیں گے۔ ان خیالات کا اظہار وزیر اعلیٰ اور اردو اکادمی دہلی کی چیئر پرسن شیلا دکشت نے کیا۔ وہ اردو اکادمی دہلی کی نئی تشکیل کردہ مجلس عاملہ کی پہلی میٹنگ کی صدارت کے بعد ہمارا سماج سے خصوصی گفتگو کر رہی تھیں۔ وزیر اعلیٰ نے کہا کہ مرحوم قمر رئیس نے جو بھی فیصلے کیے ہیں وہ کافی اچھے ہیں، ہم ان کے فیصلوں کا احترام کرتے ہیں اور ان کے اس فیصلے میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی جائے گی۔ واضح رہے کہ اردو اکادمی دہلی کے سابق وائس چیئرمین مرحوم پروفیسر قمر رئیس نے مجلس عاملہ کی میٹنگ میں 09-2008 کے سالانہ ایوارڈز کے لیے نام تجویز کرکے فہرست چیئر سالانہ ایوارڈز کے پرسن شیلا دکشت کو بھیجی تھی لیکن روایتی ایوارڈ میں ترمیم کے سبب ایوارڈ تقسیم نہیں ہوسکتے تھے۔ اس دوران پروفیسر قمر رئیس کا انتقال ہوگیا۔ میٹنگ اپنے مقررہ وقت 5 بجے شروع ہوئی۔ اور تقریباً ایک گھنٹے تک بڑے خوش گوار انداز میں چلی۔ میٹنگ میں سالانہ بجٹ پیش کیا گیا اور مستقبل میں ہونے والے پروگراموں کی تفصیلات پیش کی گئیں۔ اس دوران مجلس عاملہ کی خاتون رکن ڈاکٹر نگار عظیم نے سینئر قلم کاروں کو ملنے والی ماہانہ پنشن میں اضافہ کرنے کی تجویز پیش کی جسے چیئر پرسن شیلا دکشت نے منظور کرتے ہوئے اسے 2000 سے بڑھا کر 5000 روپئے کردیا۔ واضح رہے کہ اردو اکادمی دہلی کی جانب سے اس وقت 12 بزرگ فنکاروں کو ماہانہ پنشن دی جارہی ہے۔ میٹنگ میں تیسرا اہم فیصلہ یہ ہوا کہ اب دہلی میں موجود 300 مدارس کو کمپیوٹر تقسیم کیے جائیں گے۔ شیلا دکشت نے کہا کہ محض چند مدارس کو کمپیوٹر تقسیم کرکے ہمیں خانہ پوری نہیں کرنی بلکہ جو بھی مدارس چل رہے ہیں انھیں کمپیوٹر دیے جائیں۔ واضح رہے کہ گذشتہ دنوں دہلی سرکار کی جانب سے 11 مدارس کو ایک ایک عدد پرنٹر سمیت کمپیوٹر تقسیم کیے گئے تھے۔ میٹنگ میں صحافت پر سیمینار کرانے کی تجویز پیش کی گئی جسے منظوری دیتے ہوئے چیئر پرسن نے کہا کہ یہ تو بہت اچھا کام ہے۔ صحافت پر سیمینار ہونا چاہیے۔ مخمور سعیدی کی اس تجویز کو بھی وزیر اعلیٰ نے منظور کرلیا کہ اردو اکادمی کی طرف سے جشن جمہوریت اور یوم آزادی کے موقعوں پر ہونے والے مشاعروں میں جو شعرا مدعو کیے جاتے ہیں ان کا نذرانہ مساوی ہونا چاہیے۔ اس دوران مجلس عاملہ کے رکن ڈاکٹر علی جاوید نے کہا کہ گذشتہ دنوں اکادمی کی جانب سے جو ضمنی کمیٹیاں تشکیل دی گئی ہیں وہ بغیر مشورے کے تشکیل دی گئی ہیں، اس لیے ان پر از سر نو غور کیا جائے جس پر وزیر اعلیٰ نے کہا کہ یہ آپس کی بات ہے لہٰذا آپ لوگ کمیٹی میں ردو بدل کرسکتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ زیادہ سے زیادہ اور اچھے سے اچھے پروگرام ہونے چاہیے جو اکادمی کا مقصد ہے۔ میٹنگ میں وائس چیئرمین شریف الحسن نقوی، ایجوکیشن ڈائرکٹر رینا رے، پرنسپل سکریٹری فائنانس، پروفیسر عبدالحق، ڈاکٹر اسلم پرویز، مخمور سعیدی، ڈاکٹر دھرمیندر ناتھ، ڈاکٹر جی آر کنول، پروفیسر شمس الحق عثمانی، نرمل سنگھ نرمل، بلراج کومل، ڈاکٹر نگار عظیم، ڈاکٹر شاہد پرویز، ڈاکٹر عقیل احمد، قدسیہ قریشی، ڈاکٹر علی جاوید، مفتی عطاء الرحمن قاسمی، ڈاکٹر نجیب اختر، مولانا ساجد رشیدی، ڈاکٹر ارتضیٰ کریم اور سکریٹری ممبر سید

مرغوب حیدر عابدی نے شرکت کی۔ قبل ازیں مرحوم قمر رئیس کو دو منٹ خاموش رہ کر خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ (ہمارا سماج، دہلی)

اردو اساتذہ کا 10 روزہ اورینٹیشن پروگرام

● نئی دہلی۔ 15 اکتوبر، اکادمی برائے فروغ استعداد اردو میڈیم اساتذہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے زیر اہتمام منعقد 10 روزہ اورینٹیشن پروگرام کے استقبالیہ جلسے میں اکادمی کے ڈائرکٹر پروفیسر غضنفر نے کہا کہ اس پروگرام میں دہلی کے انگلش میڈیم اسکولوں کے اردو اساتذہ کی تدریسی صلاحیتوں کے فروغ اور ان کی رہنمائی کے لیے ہر ممکن قدم اٹھایا جائے گا۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہماری کوشش ہوگی کہ تمام مضامین کے ماہرین مدعو کیے جائیں تاکہ ان کے تجربات او رخیالات سے استفادہ کیا جاسکے۔ معروف شاعر پروفیسر شہریار نے غضنفر کی کوششوں کو سراہا اور اکادمی کے سہ ماہی رسالے ''تدریس نامہ'' کی رونمائی کی رسم ادا کرتے ہوئے کہا کہ یہ رسالہ اردو میں اپنی نوعیت کا پہلا رسالہ ہے جس میں تدریس سے متعلق معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔ یقیناً اس رسالے سے اردو اساتذہ اور اردو میڈیم اساتذہ کو نئی روشنی ملے گی۔ پروگرام کی صدارت پروفیسر اختر الواسع نے کی۔ انھوں نے کہا کہ غضنفر اردو کا کام جہاد کے جذبے سے کرتے ہیں۔ اس موقع پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شیخ الجامعہ نجیب جنگ کا پیغام بھی پڑھ کر سنایا گیا۔ پیغام میں کہا گیا کہ کسی زبان کی ترقی کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس زبان کی تعلیم کا بہتر انتظام ہو اور اس انتظام میں مزید بہتری کے لیے کسی اچھے ادارے کی ضرورت ہوتی ہے، اسی مقصد کے پیش نظر حکومت ہند کی جانب سے اردو اکادمی برائے اساتذہ کا قیام ایک اہم اور مستحسن قدم ہے۔ کوآرڈی نیٹر ڈاکٹر حلیمہ سعدیہ نے پروگرام کی نظامت کی جبکہ معروف شاعر ماجد دیوبندی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

اردو اساتذہ کی صلاحیت کے فروغ کے لیے تربیتی پروگرام

● علی گڑھ۔ 15 اکتوبر، اردو اکادمی کی جانب سے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں اردو اساتذہ کی ماہرانہ صلاحیت کے فروغ کے لیے جاری پندرہ روزہ تربیتی نصاب کا تعارف کراتے ہوئے اکادمی کے ڈائرکٹر پروفیسر قاضی افضال حسین نے بتایا کہ یہ پروگرام پندرہ دن تک چلے گا۔ انھوں نے بتایا کہ اس کا موضوع ''اردو زبان و ادب کی تدریس'' ہے اور اس میں لیکچر دینے کے لیے علی گڑھ، دہلی اور بنارس کے سینئر اساتذہ سے درخواست کی گئی ہے۔ پروفیسر قاضی افضال حسین نے ان مشکلات کا بھی ذکر کیا جو اس طرح کے تربیتی نصابات کے دوران ماضی میں سامنے آتی رہی ہیں۔ انھوں نے اساتذہ کی ذمے داریوں پر روشنی ڈالی اور کہا کہ پرائمری سطح پر اردو تعلیم اگر اچھی طرح ہوجائے تو آگے اعلیٰ تعلیم کا مرحلہ آسان ہوجاتا ہے۔ مہمان خصوصی پروفیسر ماریہ بلقیس نے پرائمری سطح پر اردو تعلیم کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ ماضی میں ابتدائی درجات میں اردو سب کے لیے لازمی تھی۔ لیکن آج صورت بدل چکی ہے اور لوگ اردو کی طرف سے غفلت برت رہے ہیں ایسے ماحول میں ہماری ذمے داری بہت بڑھ جاتی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہمیں چاہیے کہ اردو کے اخبارات و رسائل خرید کر خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی ترغیب دیں کہ وہ اردو اخبارات اپنے یہاں ضرور منگائیں۔ اس سے اردو کو فروغ حاصل ہوگا اور اردو کے اخبارات کا سرکولیشن بھی بڑھے گا۔ صدر جلسہ پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے مطالعے کی اہمیت اور اساتذہ کی ذمے داریوں کا احساس دلاتے ہوئے کہا کہ اساتذہ کو مثالی ہونا چاہیے۔ انھیں طلبہ میں مطالعے کا شوق پیدا کرنا چاہیے۔ پروفیسر انصاری نے یہ بھی کہا کہ اچھی اردو لکھنے کے لیے فارسی زبان سے واقفیت ضروری ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہمیں اپنے بچوں کو یہ احساس دلانا چاہیے کہ اردو کسی دوسری زبان سے کمتر نہیں ہے۔ انھوں نے بچوں کو ہدایت دی کہ وہ اردو کو اپنی زندگی کا حصہ بنالیں۔ انھوں نے کہا کہ مادری زبان سے اچھی واقفیت روح کی غذا ہے۔ پروگرام کے کوآرڈی نیٹر ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی نے حاضرین جلسہ اور مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ اردو صرف زبان نہیں بلکہ ایک تہذیب بھی ہے یہ ہندو مسلم مشترکہ تہذیب کی نشانی ہے۔ اس پروگرام میں پانچ غیر مسلم اساتذہ کی شرکت اس بات کا ثبوت ہے کہ اردو ہندو مسلم مشترکہ تہذیب کی آج بھی علمبردار ہے۔ (ہمارا سماج، دہلی)

اساتذہ کی پہلے جیسی عزت کیوں نہیں

● نئی دہلی۔ 19 اکتوبر، حالانکہ اس بات سے خوش ہوا جاسکتا ہے کہ اساتذہ کی تنخواہیں بڑھ گئی ہیں تاہم افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں اساتذہ کی عزت و احترام میں روز بہ روز کمی آتی جارہی ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر مظفر حنفی نے کیا۔ وہ اردو اکادمی دہلی کے زیر اہتمام قمر رئیس سلور جوبلی آڈیٹوریم میں عالمی یوم اساتذہ کے موقع پر منعقدہ ''اساتذہ کا مشاعرہ'' میں بطور صدر خطبہ پیش کررہے تھے۔ پروفیسر حنفی نے کہا کہ ایک زمانہ وہ تھا کہ جب اساتذہ تنخواہ کی فکر نہ کرتے ہوئے زیادہ سے زیادہ تدریسی خدمات انجام دیتے تھے جس کے نتیجے میں ان کی معاشرے میں اتنی عزت ہوتی تھی کہ دکاندار بھی ان کے آنے پر کھڑا ہوجاتا تھا لیکن آج اگر وائس چانسلر بھی آجائے تو شاید ہی کوئی اس کے احترام میں کھڑا ہو۔ انھوں نے کہا کہ طلبہ ہوں یا اساتذہ سب میں خودغرضی، مفاد پرستی اور تاجرانہ ذہن پیدا ہوگیا ہے جو بہت ہی تکلیف دہ

ہے۔ مشاعرے میں پروفیسر مظفر حنفی، پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر صادق علی، ڈاکٹر اسلم پرویز، پروفیسر الطاف احمد اعظمی، سید ضمیر حسن دہلوی، ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی، ڈاکٹر دھرمیندر ناتھ، ڈاکٹر جی آر کنول، ڈاکٹر نگار عظیم، پروفیسر خالد محمود، ڈاکٹر شبیر رسول، ڈاکٹر کوثر مظہری، ڈاکٹر احمد محفوظ، ڈاکٹر مولا بخش اسیر، ڈاکٹر فریاد آزر، سہیل صدیقی، عارف عثمانی، ریاضت علی شائق، رؤف رامش، منتظر سانکھوی، ڈاکٹر عفت زریں، ڈاکٹر سلمیٰ شاہین، ڈاکٹر شبانہ نذیر، ذہینہ صدیقی، شہناز زماں شبنم، حلیمہ سعدیہ شگفتہ وغیرہ نے کلام پیش کیا۔

(ہمارا سماج، نئی دہلی)

اردو سب کی زبان ہے

● دربھنگہ۔ سوشل سروسیز ٹرسٹ کے زیر اہتمام اور بہار اردو اکادمی کے مالی تعاون سے دربھنگہ کے ڈان باسکو اسکول میں ایک سیمینار بعنوان ''اسکولی تعلیم میں مادری زبان اردو کی اہمیت کا انعقاد'' کیا گیا جس کا افتتاح صدر شعبہ ہندی وڈین ایل این متھلا یونیورسٹی دربھنگہ پروفیسر پربھاکر پاٹھک نے کیا اور کہا کہ اردو زبان کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ ہمارے بچے آج اردو اور ہندی کے الفاظ کو بھولتے ہوئے انگریزی الفاظ کو از بر کرتے ہیں جو افسوسناک ہے۔ اس موقع پر شمیم فاروقی نے صدارتی خطبے میں کہا کہ شہر دربھنگہ ہندوستان کا قدیم اور تاریخی شہر ہے۔ انھوں نے کہا کہ زبان کا تعلق کسی مذہب سے نہیں ہوتا۔ پروگرام کے نگراں ڈاکٹر عقیل صدیقی نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں شکایت کی کہ پہلی بار اردو اکادمی کو 09-2008 کے لیے 92لاکھ 67 ہزار کی گرانٹ نہ صرف منظور ہوئی ہے بلکہ مذکورہ رقم مل بھی گئی ہے۔ یہ اردو نواز وزیراعلیٰ نتیش کمار اور سکریٹری جناب شہزاد انور انصاری کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ڈاکٹر ایم نہال نے کہا کہ متھلا قدیم علاقہ ہے اس کا ذکر بالمیکی کی رامائن میں بھی ہے انھوں نے کہا کہ اردو کی تعلیم کو پرائمری سطح پر اہمیت دی جائے اسی سے اردو کا فروغ ممکن ہے۔ ڈاکٹر شمیم باروی، ڈاکٹر عبدالودود قاسمی وغیرہ نے مقالے پڑھے تمام مقالوں پر بحث ہوئی۔ پروگرام میں فاروق اعظم انصاری، وارث صدیقی، علاء الدین حیدر وارثی، ذکی احمد، منور عالم راہی، سمیت کافی لوگ موجود تھے۔ اخیر میں تمام مہمانوں کا اور مقالہ نگاروں کا شکریہ نثار احمد سکریٹری سوشل سروسیز ٹرسٹ نے ادا کیا۔

(ڈاک سے)

فروغ اردو وقت کی اہم ضرورت

● حیدرآباد۔ 30 جولائی، اردو کی ترقی وترویج کے لیے اساتذہ کو تدریسی مسائل کو حل کرنا چاہیے۔ تدریس اردو کو موثر اور دلچسپ بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اساتذہ سلیس و سادہ اور عام فہم زبان کا استعمال کریں۔ کیونکہ اردو کا فروغ وقت کی اہم ضرورت ہے۔ ان خیالات کا اظہار جناب مصباح انظر، اسسٹنٹ پروفیسر، مرکز پیشہ وارانہ فروغ برائے اساتذۂ اردو ذریعہ تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے ملاپورم میں منعقدہ کیرالا کے اردو اساتذہ کے تربیتی پروگرام میں کیا۔ جناب پی کے ابوبکر، صدر شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج، ملاپورم نے اقسام نثر کا مختصر تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ کیرالا میں اردو کو عملی زندگی سے جوڑنے کی ضرورت ہے جہاں لوگوں کی مادری زبان ملیالم ہے۔ انھوں نے کلاس روم کے ساتھ ہی بازاروں میں اردو کو فروغ دینے کی ضرورت پر زور دیا۔ جناب محمد بشیر، ریسرچ آفیسر، ایس سی ای آر ٹی، تراونت پورم نے اردو اساتذہ کو اپنی استعداد میں مسلسل اضافہ کرنے کی تلقین کی۔ انھوں نے کہا کہ اردو یونیورسٹی کو چاہیے کہ کیرالا کے اساتذہ کے لیے حیدرآباد میں بھی تربیتی پروگرام منعقد کرے تاکہ انھیں اردو سیکھنے کا بہترین ماحول ملے۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

طلبہ پر دھیان نہ دینا علمی خیانت ہے

● نئی نسلوں کی تعلیمی وتدریسی ذمے داریوں سے مکمل طور پر عہدہ برآ نہ ہونا ایک طرح کی علمی خیانت ہے، جس پر قرآن میں ہلاکت کی وعید آئی ہے۔ ان خیالات کا اظہار مولانا وسیم احمد نے اشرف العلوم رشیدی میں منعقد اساتذہ کی تربیتی تقریب میں کیا۔ تقریب کی صدارت مولانا مفتی خالد سیف اللہ کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ طلبہ قومی امانت ہیں۔ ان کی تعلیم وتربیت میں کمی کرنا یا سرے سے دھیان ہی نہ دینا قومی خیانت ہے۔ شیخ الحدیث نے وقت کی قدردانی کے حوالے سے کہا کہ کسی قوم یا ملت کی تباہی و بربادی کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ نظام الاوقات کی پابند نہ ہو۔ اس موقع پر ادارہ کے استاذ فقہ مولانا محمد سلمان نے اسلاف کے واقعات سنائے اور کہا کہ طلبہ کی تربیت میں تنبیہ کو بڑا دخل ہے، لیکن یہ سب حد کے اندر ہونا چاہیے۔ ادارے کے ناظم اعلیٰ مولانا خالد سیف اللہ اور منشی عبدالحمید نے فروغ تعلیم پر زور دیا۔ عملے کے 85 افراد نے عہد کیا کہ انشاء اللہ ادارے کے جملہ ضوابط کی پابندی کرتے ہوئے نظام الاوقات پر عمل پیرا ہوں گے۔

(ہندوستان ایکسپریس، دہلی)

اردو میں بھی ریلوے کا امتحان دے سکیں گے طلبہ

● کولکاتا۔ 7 ستمبر، ریلوے کی وزیر ممتا بنرجی نے کل شام پارک سرکس میں منعقد ایک افطار پارٹی میں اس وقت خوب تالیاں سمیٹیں جب انھوں نے اعلان کیا کہ ریلوے بھرتی بورڈ کے امتحان میں اب اردو لکھنے پڑھنے والے لوگ

بھی اپنی مادری زبان میں جواب دے سکیں گے۔ اب تک صرف ہندی اور انگریزی زبان میں ہی یہ امتحان ہوا کرتے تھے۔ ممتا بنرجی نے کہا کہ اب سبھی امیدوار اپنی مادری زبان میں امتحان دے سکیں گے۔ ممتا بنرجی کے اس اعلان سے اردو والوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی ہے۔ ممتا نے اس بات کا بھی اعلان کیا کہ جلد ہی سیالدہ سے اجمیر شریف تک ایک ٹرین شروع کی جائے گی۔ خیال رہے کہ مغربی بنگال کے زائرین بہت دنوں سے اس بات کا مطالبہ کر رہے تھے کہ کولکاتہ سے اجمیر تک براہ راست گاڑی شروع کی جائے ابھی تک ان کو دہلی آکر گاڑی بدلنا پڑتی ہے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

ملا داؤد کی مثنوی 'چندائن' پر خطبہ

● نئی دہلی۔ 30 ستمبر، دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو اور فارسی کے اشتراک سے خواجہ احمد فاروقی میموریل ہال میں ''ملا داؤد کی مثنوی چندائن'' کے عنوان پر ایک خطبے کا انعقاد کیا گیا۔ پروفیسر شیام منوہر پانڈے (لندن) نے مثنوی چندائن کی اہمیت اجاگر کرتے ہوئے ملا داؤد کی تصوف سے دلچسپی مثنوی نگاری اور بارہ ماسے سے گہرے شغف پر روشنی ڈالی نیز چندائن کی اہمیت اور ادبی نقطۂ نظر سے اس کی معنویت پر سیر حاصل بحث کی۔ یہ مشہور زمانہ چشتیہ سلسلہ کی مثنوی 1379 میں فیروز تغلق کے زمانے میں قلمبند کی گئی تھی۔ موصوف نے چودھویں صدی کی اس مثنوی کے ساتھ ساتھ اس عہد پر بھی روشنی ڈالی۔ پروگرام کا آغاز صدر شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی پروفیسر ریحانہ خاتون کے تعارفی کلمات سے ہوا۔ موصوفہ نے مہمان خطیب کا تعارف کراتے ہوئے ان کی علمی سرگرمیوں اور ادبی فتوحات پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ بعدازاں صدر شعبہ اردو پروفیسر ارتضی کریم نے مہمان اور حاضری کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پروفیسر پانڈے کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کا ذکر کیا۔ پروفیسر چندر شیکھر، پروفیسر توقیر احمد خاں، پروفیسر بلقیس فاطمہ، ڈاکٹر ابوبکر عباد، ڈاکٹر ارجمند آرا سمیت شعبۂ اردو و فارسی کے اساتذہ اور طلبہ نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

شولاپور میں ڈراما فیسٹول

● مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی کے زیراہتمام مشہور ڈراما نگار حبیب تنویر کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے شولاپور میں ''حبیب تنویر اردو ڈراما فیسٹیول'' کا انعقاد کیا گیا تھا۔ جس میں حسب ذیل پانچ اردو ایک بابی ڈرامے پیش کیے گئے۔ تالیہ اپاسنا ''نجات''۔ اقرا سوسائٹی ''مساوات'' گل مہرا اکادمی ''لمحہ لمحہ'' آرٹ اکادمی ''ڈھول بج رہا ہے'' اور ایکٹ گروپ کا ''رنگ منچ کا باپو''۔ ڈراما پیش کرنے والے اداروں اور فنکاروں کو اکادمی کی جانب سے مومنٹو اور سند پیش کی گئی۔ اکادمی کے کارگزار صدر پروفیسر عبدالستار دلوی، ایکزیکیٹو افسر وقار قادری اور لکھنؤ اردو ریسرچ سینٹر کے ڈاکٹر مہاراج کشن کول نے بطور مہمانان خصوصی شرکت کی اور اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ وقار احمد شیخ رکن اکادمی نے سب کا خیرمقدم کیا۔ محمد شفیع چوبدار نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ (ڈاک سے)

جگر مرادآبادی کی 49ویں برسی

● مرادآباد۔ 9 ستمبر، جگر مرادآبادی مرحوم کی 49ویں برسی پر شہر مرادآباد میں مختلف مقامات پر پروگراموں کا انعقاد کر کے ان کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ سرسید نگر کرولا میں شمسی پبلک گرلز جونیئر ہائی اسکول میں مرحوم کے لیے قرآن خوانی ہوئی اور ایصال ثواب کیا گیا۔ اس موقع پر ایک نمائش مرحوم کی کتابوں اور خطوط و تصاویر کی لگائی گئی جن کو موجود لوگوں نے ستائشی نظروں سے دیکھا۔ کیف و قمر لائبریری کے بانی عبدالحمید شمسی نے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مرادآباد کو جگر نے ایک پہچان دلائی ہے یہ بدقسمتی ہے کہ مرادآباد والوں نے ان کی کوئی یادگار قائم نہیں کی جبکہ پڑوسی ملک پاکستان نے کروڑوں روپے خرچ کر کے ان کے نام سے لائبریری قائم کی ہے۔ ہمیں بھی مرادآباد میں ایک بڑا میوزیم قائم کرانا چاہیے جہاں پر تحقیق کرنے والے ان کے تعلق سے تمام اہم چیزوں کو حاصل کر سکیں۔ اس پروگرام میں اسکول کے بچوں نے جگر مرادآبادی کے اشعار سنا کر سامعین سے داد و تحسین حاصل کی۔ پروگرام کی نظامت عائشہ مریم نے کی اور شاہینہ، معراج، زیبا، نازیہ، فارین، گلناز، مہتاب، معلٰی، مشہر و شمسی وغیرہ نے تعاون دیا۔

راحت مولائی گرلز اسکول محلہ ڈیریہ پر تلاوت قرآن پاک اسکول کی طالبات کی جانب سے کی گئی۔ رمضان المبارک کے پیش نظر کوئی بڑا پروگرام منعقد نہ کر کے راحت مولائی میموریل سوسائٹی کے زیراہتمام ایک میٹنگ کا انعقاد زیر صدارت سابق ایم پی حافظ محمد صدیق اور زیر نظامت اسعد مولائی انجام دیا گیا۔ مقررین نے جگر مرادآبادی کو غزل کا بادشاہ بتاتے ہوئے کہا کہ ان کو ہندوستان سے بے حد پیار تھا۔ اس لیے انھوں نے پاکستان جانے سے انکار کر دیا تھا، ان کی شاعری رہتی دنیا تک لوگوں کو راستہ دکھاتی رہے گی۔ اس میٹنگ میں صوفی نسیم قلندر، ترسیم اروڑا، حسنین اختر، اطہر حسین، شہزاد قمر، انو بھو، آفتاب، اٹل کالے، نواب آصف، رئیس خان، ہادی حسن انصاری، سورج ملہوترہ، مبین خان، چودھری سلیمان، مقصود، فرحت علی، اعظم انصاری، شکیل سرور، حسنین مولائی عطائی وغیرہ شریک ہوئے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

اعزاز و اکرام

ادب کا نوبل انعام جرمن ادیبہ کو

● اسٹاک ہوم۔ 8 اکتوبر، رومانیہ نژاد جرمن ادیبہ Herta Mueller کو جنھوں نے حق رائے دہی سے محروم لوگوں اور آزادی اظہار کے لیے لڑنے والوں کی کہانیاں لکھیں 2009 کے نوبل انعام برائے ادب سے سرفراز کیا گیا ہے۔ سوئیڈنی اکادمی جو ایک کروڑ سوئیڈن کراؤن یعنی چودہ لاکھ ڈالر کے اس انعام کا فیصلہ کرتی ہے۔ The Landscape of Dispossessd کے اعتراف میں محترمہ Mueller کو نوبل انعام کے لیے منتخب کیا۔

(اخبار مشرق، نئی دہلی)

کنور نارائن گیان پیٹھ ایوارڈ سے سرفراز

● نئی دہلی۔ 6 اکتوبر، صدر جمہوریہ پرتبھا پاٹل نے آج کہا کہ ادب کا کام تفریح کرنا نہیں بلکہ سماج کی رہنمائی کرنا ہے۔ اس میں اصلاحات کے جذبات پوشیدہ ہوتے ہیں اور یہ فرد کو ناامیدی سے امید کی جانب لے جاتا ہے۔ صدر جمہوریہ نے یہاں ''تیسرا اسپتک'' کے کوی کنور نارائن کو 2005 کے لیے 41 ویں گیان پیٹھ ایوارڈ سے نوازتے ہوئے کہا کہ بہترین ادب وہی ہے جو مقبول ہوتا ہے، جو لوگوں کی زبان میں ہو اور ان کے دلوں کو چھوتا ہو۔ انھوں نے کہا کہ اس وقت ملک کو ایسے ادب کی ضرورت ہے جو ہندوستانی تہذیب و تمدن سے سرشار ہو۔ اس موقع پر کنور نارائن نے کہا کہ وہ اعزازات کو ہمیشہ سماجی قرض مانتے ہیں جسے قلم کے ذریعے چکانا ہوتا ہے۔ انھوں نے ہمیشہ اپنے وسائل کو ادب کی ترقی میں لگانے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ کویتا میرے دل کی دنیا ہے اور اسے بہت بڑی رکھنا چاہتا ہوں جس میں سب کی خوشی و غم کے لیے وافر جگہ ہو۔ ادب میرے لیے زندگی کی حقیقت ہے۔ صدر جمہوریہ نے ادب کے سب سے اعلیٰ ایوارڈ کے طور پر کنور نارائن کو 7 لاکھ روپے نقد واگ دیوی کی کانسہ مورتی، سپاس نامہ، شال نذر کیا۔ ہندی ادیبوں میں 1999 میں نرمل ورما کے بعد 2005 میں کنور نارائن کو گیان پیٹھ ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔ ان کی بہترین تصانیف میں ''چکرویو''، ''تیسرا اسپتک''، ''کوئی دوسرا نہیں''، ''آتم جئی''، ''واج شروا کے بہانے'' اور ''آکاروں کے آس پاس'' شامل ہیں۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● نئی دہلی۔ 17 ستمبر، اردو کو اگر زندہ رکھنا ہے تو اسے نئی نسلوں کو منتقل کرنا ہوگا۔ اور تب ہی نند کشور وکرم جیسی شخصیات پیدا ہوسکتی ہیں۔ یہ بات ممتاز ناقد اور ساہتیہ اکادمی کے سابق چیئرمین پروفیسر گوپی چند نارنگ نے فاروق ارگلی کی مرتبہ کتاب ''فرہاد لوح و قلم — نند کشور وکرم'' کا اجرا کرتے ہوئے کہی۔ انھوں نے کہا کہ نند کشور وکرم اردو، ہندی اور پنجابی کا لسانی سنگم اور ہندو — مسلم دوستی کا زندہ استعارہ ہیں۔ انھوں نے کہا کہ نند کشور وکرم کو سچا خراج تحسین یہی ہوگا کہ اردو کی سہ آتشہ روایت کی نئی نسل تک پہنچائیں۔

مکتبہ کمالستان اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے اشتراک سے نند کشور وکرم کی 80 ویں سالگرہ پر منعقد اس تقریب کی صدارت سابق ممبر پارلیمنٹ سید شہاب الدین نے کی۔ صدارتی تقریر میں انھوں نے نند کشور وکرم کو اردو کا مجاہد قرار دیتے ہوئے ان کے حوالہ جاتی مجلّہ ''عالمی اردو ادب'' کا خصوصیت سے تذکرہ کیا۔ انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم نے کہا کہ نند کشور وکرم ہندوستان سے زیادہ غیر ممالک میں مقبول ہیں۔ ''فرہاد لوح و قلم......'' کے مرتب فاروق ارگلی نے خیر مقدمی کلمات میں نند کشور وکرم کی اس بات کے لیے ستائش کی کہ وہ اپنے دم پر صلے کی پروا کیے بغیر اردو زبان و ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ جلسے کی نظامت کے دوران معروف شاعر فصیح اکمل نے کہا کہ نند کشور وکرم جیسے لوگ آئندہ نسلوں کو شاید ہی دیکھنے کو ملیں۔

دیگر مقررین میں پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، شریف الحسن نقوی، سریندر موہن، دیوندر اسر، یوگیندر بالی، شاہد ماہلی وغیرہ نے نند کشور وکرم کی مختلف جہتوں اور ان کی بے لوث اور بے غرض خدمات کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے ان کے 80 ویں یوم پیدائش پر انھیں مبارکباد دی اور ان کی درازیٔ عمر کی دعا کی۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● امروہہ۔ 28 ستمبر، حکومت ہند نے جامع مسجد امروہہ کے مہتمم، شہر امام اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق صدر شعبۂ فارسی مولانا سید محمد طارق کو فارسی ادب کی خدمات کے اعتراف میں اس سال کا صدارتی ایوارڈ دینے کا اعلان کیا ہے۔ حکومت ہند کی وزارت ثقافت کے اعلان کے مطابق 2009 کا صدارتی ایوارڈ نومبر کے دوسرے ہفتے میں دہلی میں منعقدہ جلسے میں صدر جمہوریہ ہند کے دست مبارک سے دیا جائے گا۔ مولانا ڈاکٹر سید محمد طارق نے 1965 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم اے کیا، 1971 میں لیکچرر ہوئے بعدازاں 14 سال تک پروفیسر، صدر شعبۂ فارسی و ڈین اور کورٹ کے ممبر بھی رہے۔ 2004 میں مولانا محمد قاسم صاحب کے انتقال کے بعد آپ کو امروہہ جامع مسجد کا مہتمم اور شہر امام اتفاق رائے سے منتخب کیا گیا۔ ڈاکٹر طارق کے زیر نگرانی اب تک درجنوں طلبہ فارسی میں ڈاکٹریٹ کر چکے اور کر رہے ہیں۔ ایک ہندو نوجوان اجے کمار بھی آپ سے فارسی پڑھ کر آئی اے ایس بن چکا ہے۔ ایوارڈ ملنے کی اطلاع پر امروہہ میں خوشی کی لہر ہے۔

(صحافت، دہلی)

● پروفیسر اعجاز علی ارشد اور ہندی کی شاعرہ ڈاکٹر شانتی جین کو شاد میموریل کمیٹی کی جانب سے ساہتیہ سادھنا سمان برائے 2009 سے نوازا گیا ہے۔ اس موقع پر انعامات تقسیم کرتے ہوئے ممبر پارلیمنٹ اور مشہور فلمی اداکار شتروگھن سنہا نے ادب اور آرٹ کی اہمیت پر کھل کر گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ فنکار ہمیشہ دلوں کو جوڑنے کا کام کرتے رہے ہیں اور آج کے عہد میں سب سے زیادہ ضرورت لوگوں کو جوڑنے کی ہے۔

جلسے کے صدر پروفیسر امتیاز احمد، ڈائرکٹر خدابخش لائبریری نے ایوارڈ پانے والوں کی خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ نہ صرف ہندوستان گیر پیمانے پر بلکہ پوری اردو دنیا میں اعجاز علی ارشد کی ادبی خدمات جانی پہچانی ہیں۔ انھوں نے ایک اچھے استاد کی حیثیت سے بھی اپنی شناخت بنائی ہے۔ اس لیے ان کی ادبی وعلمی خدمات کا اعتراف ایک بروقت قدم ہے۔ اس ادبی جلسے کا اختتام ایک محفل مشاعرہ پر ہوا جس میں اردو اور ہندی کے شاعروں نے اپنا کلام سنایا۔

اس موقع پر انجمن کے بانی اور مشہور ماہر تعلیم شری رام اوتار کھتری کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ (ڈاک سے)

● مولانا آزاد کالج، اورنگ آباد (مہاراشٹر) بانی کے لیکچرر ڈاکٹر رفیع الدین ناصر کو ان تدریسی خدمات کے اعتراف میں حکومت ہند کی جانب سے قومی مثالی معلم کے اعزاز سے نوازا گیا۔ یہ اعزاز ڈاکٹر رفیع الدین ناصر کو 5 ستمبر 2009 کو وگیان بھون نئی دہلی میں نائب صدر جمہوریہ ہند جناب حامد انصاری کے ہاتھوں پیش کیا گیا۔ یہ اعزاز نقد رقم، چاندی کے تمغے اور سرٹیفکیٹ پر مشتمل ہے۔

ڈاکٹر رفیع الدین ناصر کا انتخاب اس اعزاز کے لیے ان کی انگلش اور اردو زبان کے اعتراف میں ہے۔ وہ ایک عرصے تک ڈاکٹر رفیق زکریا کالج فار گرلس (سابقہ اورنگ آباد کالج فار ویمن، اورنگ آباد) میں اردو میڈیم اور انگلش میڈیم کے طلبہ کو پڑھاتے رہے ہیں اس دوران انھوں نے 9 معیاری سائنسی کتابیں اردو زبان کے طلبہ کے لیے تحریر کی ہیں اور اسی طرح انگلش میڈیم کے طلبہ کے لیے 9 کتابیں تحریر کی ہیں۔ جن کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر رفیع الدین ناصر تحقیقی کام میں بھی مصروف ہیں۔ انھوں نے اب تک 250 سے زائد مقامی نباتات پر تحقیق کی اور انسان اور حیوان کے علاج میں ان کے استعمال کو پیش کیا اس پر انھیں 2006 میں ساوتری سابجی فاؤنڈیشن، لکھنؤ کی جانب سے بین الاقوامی اعزاز سے نوازا گیا۔ ان کا تحقیقی کام عنقریب کتابی شکل میں منظر عام پر آرہا ہے۔ (ڈاک سے)

● نئی دہلی/بنگلور۔ 20 ستمبر، شہر کے رویندرا کلاشیترا میں ملک کے مختلف زبانوں کے ادبا جنھوں نے مشہور ومقبول تصانیف کا ترجمہ اپنی زبان میں کیا ہے ساہتیہ اکادمی نے ایوارڈ سے نوازا۔ اردو زبان میں یہ ایوارڈ نصرت ظہیر کو دیا گیا۔ جنھوں نے افتخار گیلانی کی تصنیف My days in prision کا ترجمہ "تہاڑ میں میرے شب و روز" اردو میں کیا ہے۔ آج یہاں ملک کی مختلف ریاستوں سے آئے ہوئے ادبا وشعرا کی موجودگی میں منتخب شدہ افراد کو یہ اعزاز دیا گیا۔ ساہتیہ اکادمی کے سکریٹری اگر بارا کرشنا مورتی نے آئے ہوئے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ ساہتیہ اکادمی گذشتہ کئی برسوں سے ملک کے مقبول ترجمہ نگار ادبا وشعرا کو ایوارڈ دیتی آئی ہے آج کی یہ تقریب اس کی ایک کڑی ہے۔ گجراتی میں ونود جوشی ہندی میں دشوناتھ پرساد تیواری، کنڑا میں سدالنگیا منی پوری میں شیتری راجین، ملیالی میں انور، تمل میں سلمٰی تیلگو میں این گو کے۔ آسامی میں مالنی گوسوامی، بنگالی میں بھارتی نندی، بوڈو میں پردیپ راجا برہما، انگریزی میں میناکشی شورام، کشمیری میں روپ کرشنا بھٹ، کونکنی میں این پروشتم ملیا، میتھلی میں تاراکانت جھا، ملیالم میں جیسی اروندا کشن، مراٹھی میں سوریہ نارائن رنسوبھے، نیپالی میں جیون رانا، اڑیہ میں جیوتسنا بشوال راوت، پنجابی میں ونیتا، راجستھانی میں جیٹھ مل ایچ مارو سنسکرت میں اے وی سبرمنیم، سندھی میں کملا گوکلانی کے نام ایوارڈ حاصل کرنے والوں میں شامل ہیں۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

مشاعرے

کاسۂ دل سے لہو آنکھوں سے پانی لے گیا
اپنا قصہ کہہ کے وہ میری کہانی لے گیا

● پٹنہ (پی آر) خدابخش لائبریری میں یوم خدابخش تقریبات کے تحت پچھلے دنوں ایک قومی مشاعرے کا انعقاد ہوا۔ جس کی صدارت کلیم عاجز نے فرمائی۔ اس مشاعرے میں مقامی شعرا کے علاوہ بیرونی شعرا میں مخمور سعیدی، حبیب ہاشمی، اجمل سلطان پوری، انور سلطان پوری، ایم آر قاسمی مشاعرے میں شریک ہوئے۔ مخمور سعیدی نے شمع روشن کر کے مشاعرے کا افتتاح کیا۔ مشاعرے میں جن شعرا نے اپنے کلام پیش کیے وہ تھے:

ظفر صدیقی، انور سلطانپوری، قاسم خورشید، عالم خورشید، اعجاز علی ارشد، ایم آر قاسمی، شکیب ایاز، سلطان اختر، شمیم فاروقی، مخمور سعیدی، حبیب ہاشمی، اجمل سلطان پوری، کلیم عاجز، مشاعرہ دیر رات تک جاری رہا۔ سامعین شعرا کے کلام سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ صدر مشاعرہ کے کلام کے بعد مشاعرہ اختتام پذیر ہوا۔ اخیر میں ڈائرکٹر خدابخش لائبریری ڈاکٹر امتیاز احمد نے مشاعرے کی کامیابی کے لیے تمام شعرا کرام اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔

(فاروقی تنظیم، پٹنہ)

● بریلی۔ 17 ستمبر، خانقاہ عالیہ نیازیہ علم وادب کی آبیاری کرکے اس کو زندگی بخش رہی ہے۔ حضرت شاہ نیاز سے لے کر آج تک اس خانقاہ سے روایتی شاعری زندہ ہے۔ یہ موقع جشن ولادت نصیر میاں عرف بابا صاحب ایک آل انڈیا مشاعرہ یہاں ہر سال 24 رمضان کو ہوتا ہے جس کا انتظار ملک کے عظیم شعرائے کرام کو بڑی بے چینی سے رہتا ہے۔ اس سال بھی 24 رمضان المبارک کو بابا صاحب کی صدارت اور سرپرستی میں آل انڈیا مشاعرہ ہوا جس میں کم وبیش 40 مقامی و بیرونی شعرا نے حصہ لیا۔ حضرت نصیر میاں بابا صاحب نے اپنا صدارتی کلام پیش کرتے ہوئے اپنے کلام سے سامعین کو بے ساختہ واہ واہ کرنے پر مجبور کردیا۔ آپ کے اشعار ہیں۔

گامزن راہ جنوں میں مرحبا میں ہی تو تھا
پردہ دار لامکاں تیرا پتہ میں ہی تو تھا
عذر کا کوئی نہ خانہ ہوگا
ہم پکاریں گے تو آنا ہوگا

نصیر میاں بابا صاحب کے علاوہ اس مشاعرے میں راحت اندوری، مخمور سعیدی، پروفیسر وسیم بریلوی، حبیب الرحمٰن نیازی جے پوری، نکہت بریلوی، قاسم میاں نیازی، اطہر میاں نیازی، زاہد میاں، نسیم بریلوی، احسن نیازی، غازی نیازی، طاہر فراز، متین امروہوی، جوہر کانپوری، افضل منگلوری، س ش عالم، اظہر عنایتی، سید راشد، اشوک ساحل، قرار اکبرآبادی، وغیرہ شعرا کرام کے علاوہ مقامی شعرا کے بھی کلام کو بے حد سراہا گیا۔ **(صحافت، دہلی)**

طلب جس کی جہاں تسکین پائے
تمھیں منزل ہمیں رستہ بہت ہے

● رامپور۔ 4 اکتوبر، رامپور کے شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں کی جانب سے سید نصیر نیازی المعروف بابا صاحب (خانقاہ عالیہ، نیازیہ، خواجہ قطب، بریلی) کا ان کی رامپور آمد پر پرجوش خیرمقدم کیا گیا۔ بابا صاحب کا حلقۂ عقیدت کافی وسیع ہے۔ ہندوستان بھر میں پھیلے ہوئے ان کے عقیدت مندوں کی ایک بڑی تعداد رامپور میں بھی موجود ہے۔ بابا صاحب غزل کے روایتی لہجے کے نمائندہ شاعر ہیں۔ ہر سال رمضان المبارک میں ان کی سالگرہ کے موقع پر بریلی میں منعقدہ ہونے والا مشاعرہ ہندوستان گیر شہرت حاصل کرچکا ہے۔ ان کے اعزاز میں رامپور کی ادبی وسماجی شخصیت اشرف شاہ خاں کے مکان پر ایک مشاعرے کا انعقاد کیا گیا، جس میں بابا صاحب کا استقبال کرتے ہوئے مشاعرہ کے منتظمین صولت پبلک لائبریری کے صدر س ش عالم، شاہد محمود خاں، انتظام محمد شیر اور کاشف خان نے ان کی گلپوشی کی۔ احباب رامپور انٹرنیشنل کی جانب سے اشرف شاہ خاں نے دوشالہ پیش کیا۔ اس کے علاوہ بابا صاحب کو مختلف ادبی حلقوں کی طرف سے نشان یادگار اور خوبصورت طغرے پیش کیے گئے۔ ساتھ ہی ان کی دینی وادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے سپاس نامہ بھی پیش کیا گیا۔ اس کے بعد مشاعرے کا آغاز ہوا۔ درج ذیل شعرا نے شرکت کی:

نصیر نیازی، محمد احمد خاں کاوش، ہوش نعمانی، اظہر عنایتی، اطہر میاں نیازی، طالب رامپوری، س ش عالم، شاہد محمود خاں، قاسم میاں نیازی، طرب ضیائی، نکہت آنولوی، زاہد میاں، سعید رامش، احسن میاں نیازی، رند اکبر آبادی، شارق کیفی، مکارم الحق مکارم، فرید شمسی، فہمی نصیری، ڈاکٹر جاوید نسیمی، ڈاکٹر فرید صدیقی، رازی میاں، ڈاکٹر ظہیر رحمتی، غازی میاں، نعیم نجمی، فرید نعمانی، اس موقع پر امام وخطیب جامع مسجد مولوی مظاہر اللہ خاں، ضیاء وجیہ کے ایڈیٹر ڈاکٹر شعائر اللہ خاں وجیہی، جمعیۃ علما ہند (الف) کے ضلع صدر مولانا محمد اسلم جاوید القاسمی، کے علاوہ متعدد شخصیات شامل تھیں۔ **(صحافت، دہلی)**

ہم نے اک دشت میں دیکھا کہ حکومت کا غرور
جب چڑھا ڈھیر پہ لاشوں کے، نہ زندہ اترا

● سرسی۔ 30 ستمبر، نیر سرسوی کے امریکہ کے کامیاب ادبی دورے سے واپسی پر بزم شعرا کی ایک ادبی طرحی نشست الحاج رضا سرسوی کے زیراہتمام منعقد کی گئی۔ نیر سرسوی نے تقریباً دو مہینے میں امریکہ کے اٹھارہ شہروں میں مختلف محافل اور مشاعروں میں شرکت کے ساتھ ساتھ ادبی سیمیناروں میں بھی حصہ لیا۔ یہ منقبتی نشست شہزادہ گلریز رامپوری کی صدارت اور مولانا صفی اصغر نجمی کی نظامت میں منعقد کی گئی تھی جس میں مہمان خصوصی ڈاکٹر نسیم الظفر نے نیر سرسوی کی شخصیت اور شاعری کا تفصیلی خاکہ پیش کیا اور بانی نشست رضا سرسوی نے سپاس نامہ پیش کیا۔ رضا سرسوی نے کلام پاک اور کربلا کے تبرکات پیش کیے۔ اس موقع پر نیر سرسوی نے کہا کہ امریکہ جاکر محسوس ہوا کہ اس ترقی یافتہ ملک میں بھی اردو اور رثائی ادب کا مستقبل کافی تابناک نظر آتا ہے۔ درج ذیل شعرا نے طرحی کلام پیش کیا: ڈاکٹر شاکر سیفی، معراج سرسوی، زمن عباس، صفی اصغر نجمی، چودھری ببر، شبیہ عباس، ثامن سرسوی، نقی حسن، ضیا نصیر شوبی، ارم سرسوی، ابن عباس فلک، شمیم شوذب، نیر سرسوی، ڈاکٹر نسیم الظفر، انقلاب سرسوی، خورشید سرسوی، رضا سرسوی، شہزاد گلریز، ظہیر انور، نشتر سرسوی، حیدر سرسوی، منور سحر، واحد سرسوی وغیرہ نے اپنا کلام پیش کیا۔ نشست کے اختتام پر وہاں پر موجود علما وشعرا اور اہل دانش نے نیر سرسوی کو ان کی کامیابی کے لیے مبارکباد دی اور دعاؤں سے نوازا۔ نشست میں مولانا محمد حسین الزماں، مولانا نوید عباس، مولانا مشیر حسین، مولانا حسین مہدی، مولانا سبط حیدر، علی عباس نواب، صاحب علی خاں، قمر عباس، فرقان رضا، نسیم احمد، انتظام حسین، چودھری

نواب جان، آغا حیدر، محمد شفیق، طالب حسین، ارشد عباس، محمد کاظمین، افضال حسین اور فرحت علی وغیرہ موجود تھے۔ (صحافت، دہلی)

● تملناڈو اردو رابطہ کمیٹی، چنئی کے زیر اہتمام 26 ستمبر 2009 شام سات بجے بمقام ڈی احمد علی پاریا ہائر سیکنڈری اسکول، چنئی۔ 5، عیدملن مشاعرہ برائے فرقہ وارانہ یکجہتی منعقد کیا گیا۔ مشاعرے کی صدارت، تملناڈو رابطہ کمیٹی کے صدر اور ممبر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور ممبر تملناڈو اسٹیٹ اردو اکادمی نے کی۔ مہمان خصوصی رانچی سے تشریف لائے ہوئے بزرگ شاعر جناب حیرت فرخ آبادی تھے۔ تملناڈو اور رابطہ کمیٹی کے کنوینر جناب اشفاق الرحمن مظہر نے مہمانوں کا استقبال کیا اور اسٹیج پر تشریف فرما مہمانوں کا تعارف پیش کیا۔ جناب کے ملک العزیز نے جناب حیرت فرخ آبادی کی شال پوشی کی اور کہا کہ عیدملن مشاعرہ برائے فرقہ وارانہ یکجہتی کے موقع پر جناب حیرت فرخ آبادی کی شرکت باعثِ انبساط ہے اور قومی یکجہتی کی مثال ہے۔ جلسے کا آغاز جناب صداالآمری نے قرآن پاک کی تلاوت سے کیا اور اس کے بعد جناب محمد اسحاق عابد نے نعتیہ کلام سے محفل کو پُر نور بنا دیا۔

مشاعرے کی نظامت ڈاکٹر اعجاز کمال اور جناب اشفاق الرحمن مظہر نے مشترکہ طور پر سنبھالی۔ جناب حسن فیاض، ڈاکٹر ظہیر آفاق، جناب ساغر مدراسی، جناب ملک العزیز، اشفاق الرحمن مظہر، ڈاکٹر اعجاز کمال، ڈاکٹر حبیدالرحمن احساس، شاہد مدراسی، امان اللہ راہی، صدرالآمری، حکیم محمود شریف، ماہر مدراسی اور دولت مدراسی نے اپنے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ جناب حیرت فرخ آبادی نے اپنے مخصوص انداز میں قطعات اور غزلیات پیش کیں اور سامعین سے داد حاصل کی۔ (ڈاک سے)

● نوئیڈا۔ 27 ستمبر، ڈاکٹر پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی کے مسکن C-99 سیکٹر۔ 26، نوئیڈا میں انجمن تعمیر اردو دہلی کے زیر اہتمام عید سعید اور دسہرہ کے مبارک تہواروں کی خوشی میں گنگا جمنی، قومی یکجہتی مشاعرہ لکھنؤ کے بزرگ سید خالد حسین رضوی لکھنوی کی زیرِ صدارت منعقد ہوا، نظامت گلزار دہلوی نے کی۔

مشاعرے میں دہلی اور نوئیڈا کے متعدد سخن فہم دانشور، ادیب، وکیل، سابق فوجی افسران اور معززین نے شرکت کی اور ایک دوسرے کو عید اور دسہرے کی مبارکباد پیش کی۔ شریک شعرائے کرام کے اسمائے گرامی ہیں: گلزار زتشی دہلوی، فرحت احساس، ابرار کرتپوری، شہباز ندیم ضیائی، انور باری، شاذ جہانی، اسرار احمد رازی، اپیندر مصرا (ہندی ہاسیہ رس کوی)، بابا کانپوری (ہندی ہاسیہ رس کوی)، سید خالد حسین رضوی لکھنوی، مشاعرے کے بعد گلزار دہلوی اور اٹل گپتا کی طرف سے دعوت عشائیہ پیش کی گئی۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

رسم اجرا

جرنی ٹو دی ہولی لینڈ

● نئی دہلی۔ 11 اکتوبر، ممتاز تاریخ داں پروفیسر مشیرالحسن کی کتاب ''جرنی ٹو دی ہولی لینڈ'' کا اجرا آج یہاں انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں ایران کلچر ہاؤس کی جانب سے منعقد عالمی حج سیمینار کے دوران مرکزی وزیر برائے قابل تجدید توانائی ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے کیا۔ یہ کتاب کاکوری کے امیر احمد علوی کے 1929 میں تصنیف کردہ سفرنامۂ حج ''سفر سعادت'' کا انگریزی ترجمہ ہے جو پروفیسر مشیرالحسن نے محترمہ رخشندہ جلیل کے اشتراک سے کیا ہے۔ یہ کتاب آکسفورڈ یونیورسٹی نے شائع کی ہے۔ اس موقع پر پروفیسر مشیرالحسن نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ انھیں امیر احمد علوی کے اس سفرنامے میں ایسی چیزیں ملیں جو کسی مورخ، مسلمان اور اہل ایمان کے لیے انتہائی اہم اور دلچسپ ہیں چنانچہ انھوں نے اس کا ترجمہ کرنا ضروری سمجھا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

سہ ماہی ''روزن''

● نئی دہلی۔ 27 ستمبر، ادبی اور تہذیبی رسالے سہ ماہی ''روزن'' کا اجرا ممتاز صحافی کلدیپ نیر نے آج یہاں انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں اردو سے وابستہ مقتدر شخصیات کی موجودگی میں کیا۔ رسم اجرا کے جلسے کی صدارت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق رجسٹرار خواجہ ایم شاہد نے کی۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ مہمان خصوصی اور فیض قدوائی مہمان ذی وقار کے طور پر شریک تھے۔ نظامت پروفیسر وہاج الدین علوی نے کی۔ کلدیپ نیر نے اس موقع پر اظہار خیال کے دوران اردو کو اپنا پہلا پیار قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ زبان کو استعمال کرنا بند کر دیا جائے تو لوگ اسے بھول جاتے ہیں۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کہا کہ شعروادب اور ادبی صحافت خسارے کا سودا ضرور ہے لیکن ادب یا فنون لطیفہ کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا کیونکہ یہ انسان کی باطنی اور روحانی ضرورتوں کی تکمیل کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اپنی بقا کے لیے اس پرچے کو اپنی شناخت قائم کرنی پڑے گی اور یہ کام آسان نہیں ہے۔ صدارتی کلمات میں خواجہ ایم شاہد نے کتابوں اور رسائل کی فروخت میں بتدریج کمی پر تشویش کا اظہار کیا تاہم انھوں نے مایوس نہ ہونے پر زور دیتے ہوئے ادب کو روحانی ٹانک قرار دیا۔ انھوں نے ادیبوں سے اس سوال پر غور و خوض کرنے کو کہا ہے کہ کیا ادب کے معیارات کسی تبدیلی کے متقاضی ہیں۔

فرحت احساس نے کہا کہ انسانی وجود اور اس کی بنیادی شناخت آج

جس بحران سے گزر رہی ہے، ایسے میں انسان کے لیے ادب کے علاوہ کوئی اور پناہ گاہ نہیں ہے۔ انھوں نے ادب، تہذیب اور زبان کے سرچشموں تک رسائی کی ضرورت پر زور دیا۔ فرحت احساس نے نام ونمود اور ذاتی مفادات کے حصول کے مقصد سے نکالے جانے والے رسائل کی نکتہ چینی کرتے ہوئے یہ توقع ظاہر کی کہ ''روزن'' ادبی صحافت کے اعلیٰ اقدار کو بحال کرنے میں کامیاب ہوگا۔ پروفیسر وہاج الدین علوی نے روزن کی اشاعت کو اس کے مدیر وسیم القادری کے ادبی ذوق وشوق اور اردو سے والہانہ محبت سے تعبیر کیا۔ فاروق ارگلی نے کہا کہ اردو تہذیب کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے۔ رسالے کے مدیر وسیم القادری نے خیر مقدمی کلمات میں اردو رسم خط کو زندہ رکھے جانے کی اپیل کرتے ہوئے کہا کہ اردو زندہ رہے گی تو مشترکہ تہذیب وتمدن بھی زندہ رہے گی۔

روزن کی نائب مدیر آمنہ ہمایوں سعید نے اظہار تشکر کیا۔ اس موقع پر مخمور سعیدی، شجاع خاور، سہیل احمد فاروقی، فصیح اکمل، ابرار کرت پوری، عظیم اختر، کمال جعفری، مشرف عالم ذوقی، تبسم فاطمہ، ابوبکر عباد، ارجمند آرا، شاہد پرویز، فرحت رضوی، معین شاداب، خورشید اکرم، اصغر انصاری، عرفان احمد، عمیر منظر، ہمایوں سعید، اخلاق احمد، ثمینہ اور محمد یامین انصاری سمیت اردو شعروادب اور صحافت سے وابستہ اشخاص خاصی تعداد میں موجود تھے۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

اردو — ہندی — انگریزی ڈکشنری

● نئی دہلی۔ 14 ستمبر، دہلی یونیورسٹی نے ہندی — اردو — انگریزی ڈکشنری تیار کی ہے۔ ہندی ڈے کے موقع پر 4 دیگر کتابوں کے ساتھ ڈی یو کی ڈین آف کالجز نے اس کا اجرا کیا۔ اجرا کے بعد لوگوں نے ڈکشنری خریدنا چاہی لیکن دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے انھیں مایوس واپس ہونا پڑا۔ ڈی یو کے ہندی لسانیات کے ڈائرکٹریٹ نے یہ ڈکشنری تیار کی ہے۔ 1389 صفحات پر مشتمل اس ڈکشنری کی پہلی جلد میں 717 صفحات ہیں۔ ڈائرکٹر ڈاکٹر آشا گپتا نے بتایا کہ یہ ڈکشنری سات سال کی محنت کے بعد ایم ایس عثمانی، سدھیندر کمار اور مینا عثمانی نے تیار کی ہے، ان میں سے سدھیندر کمار کی موت ہو چکی ہے۔ اس موقع پر ہندی ڈپارٹمنٹ کے ہیڈ پروفیسر سدھیش پچوری نے اس عظیم کام کے لیے ڈائرکٹریٹ کا شکریہ ادا کیا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

فہما

● حیدرآباد۔ 6 ستمبر، عہد حاضر کے ممتاز جدید شاعروں میں نمایاں حیثیت کے حامل غزل گو ڈاکٹر راہی فدائی کی کلیات غزل ''فہما'' شائع ہوکر اردو کے ادبی حلقوں میں مقبول ہو رہی ہے۔ 592 صفحات پر مشتمل اس کلیات غزل میں راہی فدائی کا شروع سے اب تک کا سارا غزلیہ سرمایہ یکجا کر دیا گیا ہے۔ کلیات کی تعداد اشاعت 786 ہے جو راہی فدائی کے مذہبی میلان کا اشاریہ ہے۔ ''فہما'' میں سابقہ مجموعوں میں شامل 15 اہم قلمکاروں کے مضامین شریک کیے گئے ہیں۔ جن میں شمس الرحمٰن فاروقی، مجتبیٰ حسین، ڈاکٹر معین الدین عقیل، عرفان صدیقی اور پروفیسر نجم الہدیٰ شامل ہیں۔ ان مضامین سے راہی فدائی کے نظام فکر، ان کے اسلوب اور ان کے موضوعات کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔

(ہندوستان ایکسپریس، دہلی)

وجود کی پہچان

● حیدرآباد۔ 7 اگست، نیرنگ ادب کے زیر اہتمام پچھلے دنوں اردو ہال حمایت نگر میں شاغل ادیب کے آٹھویں مجموعۂ کلام ''وجود کی پہچان'' کی رسم اجرا تقریب منعقد ہوئی جس کی صدارت حسن فرخ نے کی۔ صلاح الدین نیر نے رسم اجرا انجام دی۔ جنرل سکریٹری نیرنگ ادب یوسف الدین یوسف ناظم ادبی اجلاس ومشاعرہ تھے۔ اس تقریب کے مہمانان خصوصی ومقررین میں ڈاکٹر عطا اللہ خان، ڈاکٹر سید بشیر احمد، ڈاکٹر محمد ثنا اللہ ثانی، جناب قاضی فاروق عارفی اور نانک سنگھ نشتر شامل تھے۔ مشاعرے کی صدارت مسرور عابدی نے کی۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے کامل حیدرآبادی، جلال عارف، قدیر انصاری، مصطفیٰ نیاز، قاضی فاروق عارفی، نانک سنگھ نشتر نے شرکت کی اور کلام سنایا۔ ان کے علاوہ صلاح الدین نیر، شاغل ادیب، یوسف الدین یوسف، عبدالوہاب غوری، محبوب علی محبوب، شکیل مظہر، افضل عارفی، مظفر الدین ذکی، میر داور علی داور نے بھی کلام سنا کر داد حاصل کی۔ صلاح الدین نیر نے کہا کہ تمام ادبی حلقے شاغل ادیب کی شاعرانہ وادیبانہ خدمات کے معترف ہیں۔ حسن فرخ نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ ان کی شاعری کا رشتہ کلاسیکی شعری ادب کے ساتھ جدید شعری ادب سے بھی ہے۔ نانک سنگھ نشتر نے کہا کہ اچھا شاعر اچھی نثر بھی لکھتا ہے۔ ڈاکٹر محمد ثنا اللہ خان ثانی نے شاغل ادیب کے فن وشخصیت پر مضمون پیش کیا۔ (منصف، حیدرآباد)

وفیات

مولانا اخلاق حسین قاسمی

● نئی دہلی۔ 13 اکتوبر، معروف عالم دین مفسر قرآن مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی کا آج بعد نماز مغرب انتقال ہوگیا وہ 86 سال کے تھے۔ ان کی تدفین مہندیان قبرستان میں ہوئی۔ مولانا اخلاق حسین قاسمی 1960 کی دہائی

میں کانگریس پارٹی سے میونسپل کارپوریشن کے ممبر رہے، انھوں نے اپنی زندگی میں 50 سے زائد کتابوں کی تصنیف کی۔ صحافتی خدمات پر صدر جمہوریہ کی طرف سے ایوارڈ بھی دیا گیا۔ اور اردو اکادمی کی جانب سے بھی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ان کے پسماندگان میں ایک بیوہ 7 لڑکے اور 3 لڑکیاں ہیں۔ پوری زندگی فقیرانہ گزار کر تصنیف و تالیف میں مصروف رہے وہ مولانا احمد سعید کے شاگرد تھے اور دہلی کے لب و لہجے کے بے مثال مقرر تھے۔ ان کے انتقال پر قومی اردو کونسل کی تعزیتی نشست میں کہا گیا کہ وہ دہلی کے آخری بزرگ عالم دین اور دہلی کی تہذیبی اقدار کے معتبر امین تھے۔ ان کی آخری شمع کی رحلت سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ کبھی پورا نہیں ہوسکتا۔

محمود ہاشمی

● نئی دہلی۔ 23 ستمبر، اردو کے مشہور ادیب اور نقاد محمود ہاشمی کا گزشتہ شام اوکھلا (بٹلہ ہاؤس) میں طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 73 سال تھی۔ مرحوم کے پسماندگان میں 2 بیویاں، 4 بیٹے اور ایک بیٹی شامل ہے۔ اردو کے ایک ممتاز ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ صحافت سے بھی ان کا بہت گہرا رشتہ تھا۔ آل انڈیا ریڈیو میں ان کی غیر معمولی خدمات تھیں نیز بی بی سی لندن سے بھی وہ وابستہ رہے۔ اردو کے عہد ساز ادیب حسن عسکری ان کے خاص قدر شناسوں میں تھے۔ محمود ہاشمی کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جنھوں نے جدیدیت کی فکری بنیادیں استوار کیں اور وہ شروع سے ہی اس رجحان کے مفسر رہے۔ ابھی کچھ دنوں پہلے ان کی ایک اہم کتاب ''انبوہ زوال پرستاں'' منظر عام پر آئی تھی۔ اس سے قبل سوغات کا جدید نظم نمبر ترتیب دینے میں محمود ہاشمی کا اہم کردار رہا۔ ان کی ایک اور کتاب ''جدید ذہن کی جلاوطن آبادیاں'' بھی تھی۔ مرحوم کی تدفین آج سینکڑوں افراد کی موجودگی میں بٹلہ ہاؤس قبرستان میں بعد نماز ظہر کی گئی۔

محمود نقوی

● لکھنؤ۔ 24 ستمبر، اردو کے نامور ادیب اور 15 روزہ ''حدیث دل'' دہلی کے ایڈیٹر محمود نقوی ہمارے درمیان نہیں رہے۔ طویل علالت کے بعد ان کا انتقال آج صبح ایرا میڈیکل کالج لکھنؤ میں ہوگیا۔ تدفین رات تقریباً 10 بجے غفراں مآب میں ہوئی۔ پسماندگان میں دو بیٹے عزیز حیدر (مقیم لکھنؤ)، تقی حیدر (مقیم حال ایران برائے تعلیم) اور بیٹی ہے جو اپنے شوہر کے ساتھ ایران (قم) میں ہے۔ الٰہ آباد سے تعلق رکھنے والے محمود نقوی نامور عالم دین مولانا انوار حسنین کے بڑے فرزند اور مولانا علی نقی (مولانا نقن) کے داماد تھے۔

میناکشی مکھر جی

● نئی دہلی۔ 17 ستمبر، انگریزی کی مشہور ادیبہ اور ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ میناکشی مکھر جی کل حیدرآباد میں چل بسیں۔ 72 سالہ مکھر جی کی آج یہاں آخری رسومات ادا کردی گئیں۔ پسماندگان میں دو بیٹیاں ہیں۔ ان کے شوہر اور ادیب سجیت مکھر جی کا چند سال پہلے ہی انتقال ہوگیا تھا۔ محترمہ مکھر جی پٹنہ میں پیدا ہوئی تھیں۔ انھوں نے پٹنہ یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی اور جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ کچھ عرصے حیدرآباد یونیورسٹی سے بھی وابستہ رہیں۔ انھیں 2005 میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ محترمہ مکھر جی نے مشہور مورخ آرتی دت کی سوانح حیات لکھی تھی۔ جس کا اجرا آج شام کو یہاں ہونا تھا۔ وہ اس تقریب میں شرکت کے لیے کل حیدرآباد سے دہلی آرہی تھیں کہ ہوائی اڈے پر بے ہوش ہوگئیں۔ انھیں اسپتال لے جایا گیا جہاں ڈاکٹروں نے انھیں مردہ قرار دیا۔ متعدد ادیبوں اور مصنفین نے محترمہ مکھر جی کے انتقال پر تعزیت کا اظہار کیا ہے۔

جانے والوں کی یاد

● حیدرآباد۔ 25 جولائی، ڈاکٹر سید عبدالمنان ایک حاذق طبیب تھے۔ اس کے علاوہ وہ سماجی اور فلاحی کاموں میں بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ رائے منوہر راج سکسینہ حیدرآبادی تہذیب کے نمائندہ تھے اور چاہتے تھے کہ حیدرآباد قومی یکجہتی کا گہوارہ بنا رہے۔ ان دونوں حضرات نے حیدرآباد اور یہاں کی تہذیب سے نہ صرف محبت کی بلکہ اس کو برقرار رکھنے کے لیے ہر طرح سے کوشاں رہے۔ ان خیالات کا اظہار جناب غلام یزدانی سینئر ایڈوکیٹ نے ڈاکٹر سید عبدالمنان اور رائے منوہر راج سکسینہ کے لیے منعقدہ جلسۂ تعزیت میں کیا جس کا اہتمام انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش نے اردو ہال میں کیا تھا۔ ابتدا میں محمد عبدالرحیم خاں صاحب معتمد عمومی انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش نے جلسے کی کارروائی کا آغاز کرتے ہوئے ڈاکٹر سید عبدالمنان کی اردو اور انجمن ترقی اردو سے گہری وابستگی کا ذکر کیا۔ موصوف نے ڈاکٹر سید عبدالمنان کی زندگی کے مختصر حالات پیش کرتے ہوئے ان کی گوناگوں مصروفیتوں کا جائزہ لیا۔ رحیم خاں کے خطاب کے بعد نصرت محی الدین نے رائے منوہر راج سکسینہ کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اردو ان کی مادری زبان تھی اور اس زبان کی ترقی و ترویج کے لیے انھوں نے اہم خدمات انجام دیں۔ پروفیسر اشرف رفیع نے کہا کہ ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں جو مختلف میدانوں میں اپنی دلچسپی کو قائم رکھ سکیں۔ یہ وصف مرحومین میں تھا۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اپنے مزاج کی ناسازی کے باوجود اس جلسے میں شریک ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان دونوں حضرات کے مشن کو آگے بڑھایا جائے

اور اردو کی ترقی کے لیے تندہی سے کام کیا جائے۔ سابق ممبر پارلیمنٹ جناب خلیل الرحمٰن نے کہا کہ ان دونوں حضرات نے اردو کی تعلیم و ترویج کے لیے مثالی خدمات انجام دیں۔ جناب عزیز پاشاہ ممبر پارلیمنٹ نے کہا کہ ڈاکٹر سید عبدالمنان انجمن ترقی اردو کے مسائل سے پوری طرح واقف تھے اور ان کے حل کے لیے مناسب تجاویز دیا کرتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ رائے منوہر راج سکسینہ کی مذہبی رواداری اپنی مثال آپ تھی۔ وہ پرانے شہر حیدرآباد کے لیے ہمیشہ فکرمند رہا کرتے تھے۔ محترمہ لکشمی دیوی راج نے کہا کہ ڈاکٹر منان کی شخصیت ایسی تھی کہ مریض صرف ان سے ملاقات کر کے ہی تندرست ہو جایا کرتے تھے۔ منوہر راج سکسینہ دکن کی گنگا جمنی تہذیب کے علمبردار تھے۔ پدم شری مجتبیٰ حسین نے حیدرآباد کی تہذیب کو منان منوہر تہذیب کا نام دیا۔ حیدرآباد لٹریری فورم کی نمائندگی کرتے ہوئے جناب علی ظہیر نے ڈاکٹر سید عبدالمنان اور رائے منوہر راج سکسینہ کو خراج پیش کیا۔ جناب نانک سنگھ نشتر نے کہا کہ یہ دو شخصیتیں دو انجمنیں تھیں اور ان دونوں کا پیام آگے بڑھانے کے لیے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر رحیم الدین کمال پروفیسر سلیمان اطہر جاوید، جناب شاہد حسین زبیری، لغت مجتہدی کے مولف جناب یعقوب میراں مجتہدی نے ایک خطیر رقم عطا کی تھی۔ اردو مجلس کے صدر پروفیسر رحمت یوسف زئی نے کہا کہ ڈاکٹر سید عبدالمنان اور ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے اردو زبان کے توسط سے ایم بی بی ایس کیا تھا۔ گوڑ صاحب نے اس پیشے کو خیر باد کہہ دیا لیکن منان صاحب لحۂ آخر تک طبابت سے وابستہ رہے۔ پروفیسر رحمت یوسف زئی نے جناب منوہر راج سکسینہ کے ارتحال پر اظہار ملال کرتے ہوئے کہا کہ یہ منوہر راج سکسینہ اور ڈاکٹر منان کے مابین شدید وابستگی کا ثبوت ہے کہ دونوں نے ایک ہی دن داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ □□□

آئینۂ جہاں (کلیات قرۃ العین حیدر)

''آئینۂ جہاں'' جلد اوّل میں قرۃ العین حیدر نے قدیم و جدید ہندوستانی تہذیب کو جس خوبصورتی اور فن کارانہ مہارت کے ساتھ اپنی تحریروں میں سمویا ہے وہ انھی کا حصہ ہے۔ کلیات کی اس جلد میں 35 افسانے شامل ہیں جو گذشتہ ساٹھ ستر سال کے تیزی سے بدلتے ہوئے سماجی منظرنامے کی جھلکیاں پیش کرتے ہیں۔ یہ افسانے اس وقت لکھے گئے جب مصنفہ کا تعلیمی سلسلہ جاری تھا اور ان کے بقول اس مجموعے کے کئی افسانے یونیورسٹی کے افسانوی ماحول سے تعلق رکھتے ہیں۔

صفحات—600، قیمت— 266روپے

''آئینۂ جہاں'' جلد دوم میں 32 افسانے شامل ہیں جن میں ''فقیروں کی پہاڑی''، ''فوٹوگرافر''، ''روشنی کی رفتار''، ''یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے'' اور ''آوارہ گرد'' جیسے افسانے بھی ہیں جو اردو افسانے کے تحت سے تحت انتخاب میں شامل کیے جا سکتے ہیں تو دوسری طرف ''دکھلائیے لے جا کے تجھے مصر کا بازار'' اور ''میں بوری ڈوبت ڈوری'' جیسے افسانے بھی ہیں جن سے قرۃ العین حیدر کے ذہنی ارتقا کا اندازہ ہوتا ہے۔

صفحات—612، قیمت — 270روپے

''آئینۂ جہاں'' کی اس تیسری جلد میں قرۃ العین حیدر کے پانچ ناولٹ— ''سیتاہرن''، ''چائے کے باغ''، ''ہاؤسنگ سوسائٹی''، ''اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو'' اور ''دل ربا'' تاریخی ترتیب سے شامل ہیں۔ قرۃ العین حیدر نے اپنے پورے فکشن بشمول ناولٹ میں اپنے تجربات و مشاہدات کو مختلف خواتین کے کردار میں پیش کیا ہے جو زندگی میں ہر قدم پر مصالحت کرتی آرہی تھیں لیکن آج اصولوں کی خاطر جان کی بازی لگانے پر آمادہ ہیں۔ یاتو، پکھراج اور گٹار بجانے والی، روشنی کی رفتار سے پرواز کرنے والی اب ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں کی متلاشی ہے۔

صفحات—502، قیمت—230روپے

''آئینۂ جہاں'' جلد چہارم میں وقت اور تہذیب کی قلابازیوں کی حسین تفسیر بیان کرنے میں قرۃ العین حیدر کو مہارت کاملہ حاصل ہے۔ عہد ایسٹ انڈیا کمپنی سے ہندوستان میں جس دورنگی معاشرت کی نمود ہوئی اور اس وقت سے لے کر اب تک ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب جن نشیب و فراز سے دوچار ہوئی ان کی جھلکیاں جلد چہارم کے افسانوں میں دکھائی دیتی ہیں۔ اس جلد میں قرۃ العین حیدر کے ایسے اکیس افسانے شامل ہیں جو اب تک ان کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہوئے تھے۔ اس میں ان کا وہ اوّلین افسانہ بھی ہے جو ''ایک شام'' کے عنوان سے ''ادیب'' نومبر 1943 میں ''لالہ رخ'' کے فرضی نام سے شائع ہوا تھا۔

صفحات—758، قیمت—384روپے

● **چاروں جلدوں کے مرتب جمیل اختر ہیں جنھوں نے مصنفہ کی نگرانی میں یہ اہم کام انجام دیا ہے۔**

تبصرہ وتعارف

سخنورانِ گجرات

مصنف: سید ظہیر الدین مدنی
صفحات: 344، قیمت: -/77
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6،
آر.کے. پورم، نئی دہلی
مبصر: سعید رشیدی، 142، جھیلم، جے. این. یو. نئی دہلی-110067

اردو زبان کی ابتدائی شکل کے فروغ میں گجرات کا کافی اہم رول رہا ہے۔ یہ کتاب گجرات میں اردو کے آغاز وارتقا پر محیط ہے۔ موضوع کے اعتبار سے یہ ادبی تاریخ ہے لیکن یہ محض تاریخی بیانیہ نہیں ہے۔ مصنف کا تنقیدی ذہن ساتھ ساتھ چلتا ہے اور عمیق مطالعے کا پتا دیتا ہے۔ تحقیق نہایت دقت طلب کام ہے جس میں موضوع سے انصاف کرنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ سید ظہیرالدین مدنی کو ادبی تاریخ سے ذہنی مناسبت ہے۔ یہ کتاب ان کے تحقیقی مقالے پر مبنی ہے۔ جس پر 1948 میں انھیں ممبئی یونیورسٹی نے پی.ایچ.ڈی. کی ڈگری تفویض کی۔ یہ مقالہ 1400 سے لے کر 1950 تک کی ادبی، سماجی اور سیاسی تاریخ کا احاطہ کرتا ہے۔

اردو کی پیدائش کے سلسلے میں اب تک کئی مختلف نظریات سامنے آئے ہیں۔ مصنف نے گجرات کو اردو کے مولد کی حیثیت سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ آٹھویں صدی عیسوی میں گجرات میں ایک مخلوط زبان کی بنیاد پڑ چکی تھی اور گمان غالب ہے کہ بعد میں پنجاب، دہلی اور گجرات کی ملی جلی بازاری بولیوں نے سیاسی، تجارتی اور سماجی اسباب کی بنا پر باہمی اختلاط سے ایک مخلوط بولی کی صورت اختیار کرلی جو ارتقائی منازل طے کرنے کے بعد اردو کے نام سے مقبول ہوگئی۔ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اس مخلوط بولی یعنی اردو کو اس کے ابتدائی زمانے میں سب سے زیادہ قبولیت گجرات میں حاصل رہی جہاں یہ اتنی عام ہوچکی تھی کہ پندرھویں صدی میں اس کو ادبی صورت مل گئی۔ گجرات میں اردو ادب کی نشاندہی پندرھویں صدی کے نصف آخر سے کی جاتی ہے۔ اس ابتدائی عہد میں صوفیائے کرام نے اردو کو اپنایا اور رشد وہدایت کا ذریعہ بنایا۔ اور اسے گجری کے نام سے موسوم کیا۔ مولوی عبدالحق، حافظ محمود شیرانی، مولوی شمس اللہ قادری، ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور وغیرہ وہ بلند قامت محققین ہیں جنھوں نے گجری ادب سے دلچسپی لی ہے۔ ان کے تحقیقی کارنامے نہایت اہم ہیں جن سے رجوع کیے بغیر اس موضوع کا کوئی محقق یا طالب علم آگے نہیں بڑھ سکتا۔ گجرات کے قدیم شہ پارے ہنوز پردۂ خفا میں ہیں۔ پانچ سو سال کے طویل عرصے میں سیکڑوں ادبی کارنامے وجود میں آئے ہوں گے اور سیکڑوں شاعر بھی گزرے ہوں گے مگر اب تک ان میں سے معدودے چند کا علم ہوسکا ہے۔ جیسے جیسے تحقیق ہوتی گئی ویسے ویسے نئے متون روشنی میں آتے گئے۔ ان کی تدوین پر توجہ دی گئی۔ ادبی اور لسانی نقطۂ نظر سے ان کی حیثیت کلیدی ہے۔

یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر باب میں سیاسی، سماجی پس منظر کے علاوہ شعرا کا تذکرہ، ان کے کلام پر تبصرہ اور نمونۂ کلام پیش کیا گیا ہے۔ آخر میں تین ضمیمے ہیں۔ پہلا گجرات کے کچھ معزز خاندانوں کے حالات اور ان کی علمی، ادبی، سیاسی، مذہبی جذبات پر مبنی ہے۔ دوسرا ضمیمہ گجرات کے چند نثری کارناموں سے متعلق ہے۔ تیسرے میں مختلف کتب سے ماخوذ شعرا کی فہرستیں درج کی گئی ہیں۔ پہلے باب سے قبل مصنف کا بھرپور مقدمہ ہے جس میں انھوں نے اپنے مطالعے کی روشنی میں گجری ادب کا خاطر خواہ تعارف کرایا ہے اور بعض بہت اہم پہلوؤں کو نشان زد کیا ہے۔ انھوں نے گجرات کی قدیم تاریخ پر تفصیلی نگاہ ڈالی ہے۔ اردو کی پیدائش کے دیگر خطوں اور نظریات کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے گجری کی لسانی قدر و قیمت متعین کرنے کی کوشش کی ہے جس میں تمام ممکن اور دستیاب شدہ ماخذوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ ہندی، ہندوی، زبانِ ہندوستان، ہندوستانی، ریختہ، زبان اردوے معلّی جیسے ناموں سے اردو کو موسوم کیا گیا ہے لیکن علاقائی بنیاد پر گجری اور دکنی اردو کے سب سے قدیم نام ہیں۔ پندرھویں صدی کے نصف آخر میں اردو نے ادبی شکل اختیار کی اور سولھویں صدی کے اوائل سے گجرات میں مستقل تصانیف کا سلسلہ پایا جاتا ہے۔ اس اولین عہد کے مصنفوں میں شاہ بہاؤ الدین باجن، قاضی محمود دریائی، علی جیوگام دھنی، خوب محمد چشتی کے نام اور ان کی ادبی خدمات منصۂ شہود پر آچکی ہیں۔

اردو اپنے ارتقائی دور سے گزرتے ہوئے دہلی میں دہلوی، گجرات میں گجری اور دکن میں دکنی کہلائی، لیکن مجتہد العصر ولی (گجراتی) نے اجتہاد سے کام لیتے ہوئے شمال اور جنوب کے فرق کو ختم کیا اور ایک واحد اسلوب کو رواج دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنی زبان کو نہ تو گجری کہا اور نہ دکنی، بلکہ کہیں ہندی کہتا ہے اور کہیں ریختہ سے موسوم کرتا ہے۔ مصنف نے ولی کے حالات اور کلام پر تفصیلی نظر ڈال کر بعض اہم اختصاص کو روشن کیا ہے۔ انھوں نے گجری کو لسانیاتی نقطۂ نگاہ سے بھی دیکھنے کی کوشش کی ہے اور اس کی قواعد، تراکیب اور الفاظ کی ساخت، واحد جمع کے طریقے کی وضاحت کی ہے۔ نیز دیگر ہندوستانی زبانوں کی قواعد سے اس کا تقابل کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "صوفیا نے شعر گوئی کو ادبی نقطۂ نظر سے نہیں اختیار کیا تھا۔ اس وجہ سے ان کے ہاں تلفظ اور املا کا کوئی التزام نہیں پایا جاتا۔" لیکن بعد میں خوشگوار تبدیلی آئی اور ادبی اظہار کے لیے شعر گوئی بہترین وسیلہ قرار پائی۔ ظہیرالدین مدنی کی زبان صاف اور طرز استدلالی ہے۔ اردو کی قدیم ادبی اور

لسانی تاریخ کے مطالعے میں یہ کتاب یقیناً ایک اہم اضافہ ہے جس میں گجری کے خط و خال بہتر طور پر روشن ہوئے ہیں اور اس کی تاریخی اہمیت کا بھی احساس ہوتا ہے۔ اردو زبان کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ کتاب دلچسپ ہے۔ سنجیدہ ادبی قارئین اور طلبہ کے لیے اس کا مطالعہ مفید ہوگا۔

کتاب کی تاریخ

مصنف: شایاں قدوائی

صفحات: 280، قیمت: -/75

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی

مبصر: عبدالسمیع، 102 کاویری ہاسٹل، جے. این. یو، نئی دہلی-67

آج کتاب کا لفظ سن کر ذہن میں کتاب کی واضح تصویر ابھر آتی ہے۔ لیکن اگر ہم ماضی کی طرف دیکھیں اور اس عہد پر نظر ڈالیں جب کاغذ کا چلن عام نہ ہوا تھا یا اس سے بھی قبل جب لکھنے کا چلن وجود میں نہ آیا تھا۔ تو اس وقت کتاب کا کیا تصور رہا ہوگا؟ ہمارا ذہن بالعموم اس طرف نہیں جاتا۔ زیر نظر کتاب اردو میں اپنی نوعیت کی اہم کتاب ہے جس میں کتاب کی تاریخ تفصیل کے ساتھ تاریخی تسلسل میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مصنف نے ابتدائیہ میں ترتیب وار ان مسائل کی طرف اشارے کیے ہیں جن سے کتاب میں بحث کی گئی ہے۔ مصنف کے الفاظ ہیں:

1. کتاب کی عبارت اور الفاظ کے قائم مقام علامات جن کو ہم حروف کہتے ہیں، ان کی مکمل تشریح اور تاریخی ارتقا۔
2. جس چیز پر کتاب لکھی یا چھاپی جاتی ہے (آج عموماً اسے کاغذ کہتے ہیں) اور جن چیزوں کے ذریعے یہ کام انجام دیا جاتا ہے (ہم اسے قلم اور پریس کہتے ہیں) تاریخ کی روشنی میں ہر عہد میں مستعمل ساز وسامان کی تفصیل۔
3. کتاب وجود میں لانے کے عہد بہ عہد مختلف طریقے اور ان کی متبادل شکلیں۔
4. کتاب کی آرائش اور تصویر کاری۔
5. کتاب کی جلد بندی۔ کتب خانے اور مختلف ادوار میں ان کی تنظیم۔
6. کتاب کی اشاعت اور تجارت کی سرگرمیاں
7. کتاب کے مواد اور طباعت سے متعلق ضابطے اور قوانین۔

مختلف قوموں کی تہذیبی تاریخ، علاقائی خصوصیات کو جس سلجھے ہوئے انداز میں شایاں قدوائی نے بیان کیا ہے وہ داد طلب ہے۔

کتاب چار حصوں میں منقسم ہے۔ حصہ اول: ''قدیم کتابیں'' حصہ دوم: ''عہد وسطیٰ کی کتابیں''، حصہ سوم: ''مشینی دور کا آغاز اور کتابی تکنیک کی ارتقائی لہر اور حصہ چہارم: ''جدید ہندوستان اور صنعت کتاب کی عالمی تنظیم'' کے عنوانات سے ہیں ان عنوانات کے تحت چند ذیلی عنوانات بھی قائم کیے گئے ہیں۔

حصہ اوّل ''قدیم کتابیں'' آٹھ ابواب میں منقسم ہے۔ جن میں مٹی کے اوراق کی کتابیں، لکڑی کی تختیوں، اور ریشم پر لکھی کتابیں، قدیم ایران و ہندوستان کی کتابیں، صوتی حروف تہجی کی ابتدا (فنیقی قوم) اہم ہیں تحریر کی ابتدا کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

''تحریر کی سب سے ابتدائی کڑی وہ لکیریں ہیں جو پتھر کی سلوں اور چٹانوں کے علاوہ بارہ سنگھے کے سینگوں، کچھوے کے کھپروں، بانس کے ٹکڑوں، درختوں کی چھال، سیپ، گھونگے، ہاتھی دانت اور مونگے کے ٹکڑوں پر زمین کے مختلف حصوں میں پڑی ہوئی ہیں۔''

دوسرا حصہ عہد وسطیٰ کی کتابوں سے متعلق ہے اس حصے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا (مذہبی کتابیں) دوسرا۔ عرب اسلامی تہذیب، تیسرا کلیسائے روم کی کتابیں، چوتھا کاغذ کی ابتدا اور پانچواں مغرب میں چھپائی کا آغاز۔ کاغذ کی ابتدا سے متعلق لکھتے ہیں:

''کاغذ کی ایجاد کا سہرا در اصل چین کے سر ہے۔ اس نے اس صنعت کی دریافت ایک اندازے کے مطابق 104 میں کرلی تھی۔ لیکن تقریباً سات سو برس تک دنیا کو اس ہنر سے بے خبر رکھا تھا۔''

کتاب کا تیسرا حصہ جو مشینی دور کے آغاز اور کتابی تکنیک کے ارتقائی عوامل سے متعلق ہے، آٹھ ابواب میں منقسم ہے جن میں سولھویں صدی: نئی مطبوعہ کتابیں، مصور کتابوں کی طباعت، کتاب کی جلدیں، امریکی اور روسی چھاپے خانے، کتب خانے اہم ذیلی ابواب ہیں۔

کتاب کے اس حصے میں مصنف نے جن نکات پر بحث کی ہے اس سے ان کے وسیع مطالعے کا علم ہوتا ہے۔ امریکی، روسی اور عصری چھاپے خانوں نیز وہاں کے کتب خانوں سے متعلق جو معلومات فراہم کی گئی ہیں وہ قابل داد ہیں۔ روسی چھاپے خانے سے متعلق لکھتے ہیں:

''روس میں چھپائی کی ابتدا 1564 میں ہوئی۔ جب آئیون فیڈ دروف نے ماسکو میں پہلا چھاپہ خانہ قائم کیا۔ اور پہلی کتاب چھاپی۔ اسے اپنی پہلی کتاب مکمل کرنے میں پورا ایک سال لگ گیا۔''

کتاب کے آخری حصے کا عنوان ''جدید ہندوستان اور صنعت کتاب کی عالمی تنظیم ہے۔ اس حصے میں چھ ابواب ہیں اردو زبان، چھپائی کا ہندوستان پہنچنا۔ عیسائی تبلیغی جماعتیں، ہندوستان کے جدید ناشرین کتب اور ان کی حالیہ اشاعتی سرگرمیاں اہم ذیلی ابواب ہیں۔ اردو زبان والے حصے میں اردو رسم الخط اور خطاطی کے موضوع پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ اردو کی ابتدا اور اس کی ابتدائی کتابوں نیز اردو کے پہلے اشاعتی ادارے سے متعلق لکھتے ہیں:

''اردو مطبوعات کا سب سے قدیم تاریخی ادارہ فورٹ ولیم کالج اور گل کرسٹ کی سوسائٹی سب سے پہلی اردو سوسائٹی ہے۔''

کتاب کے آخر میں ضمیمہ ہے جس کا عنوان ''دنیا کے تمام حروف اور رسوم

خط کے باہمی رشتے اور ان کے سلسلے کا ایک خاکہ'' ہے اس میں دنیا کے مختلف رسوم خط کے نمونے دیے گئے ہیں جو ایک تحقیقی کام ہے۔

یہ کتاب اپنے موضوع پر معلومات کا خزانہ ہے۔ اس نوعیت کی کتابیں اردو میں شاذ و نادر ہی لکھی جاتی ہیں اس لیے اس کتاب کو ہر باذوق قاری کے پاس ہونا چاہیے۔

کلیات اسعد بدایونی

مرتب: رضوان الرضا رضوان

صفحات: 507، قیمت: -/205 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی

مبصر: محمد امتیاز عالم، روم نمبر 157، پیریار ہاسٹل، جے. این. یو، نئی دہلی

بیسویں صدی کی ساتویں دہائی کے بعد جو شعرا اردو شاعری میں منفرد لب و لہجے کے شاعر کہلائے ان میں ایک نام اسعد بدایونی کا بھی ہے۔ وہ کثیر الجہات شخصیت کے مالک تھے اور انھوں نے مختلف شعبوں میں اپنی کارکردگی کے نقوش ثبت کیے۔ لیکن انھیں شہرت ایک غزل گو شاعر کی حیثیت سے ملی۔ زیر تبصرہ کلیات ان کے تمام دستیاب کلام پر مشتمل ہے۔ اس میں ان کے مجموعہ ہائے کلام گل رنگین، دھوپ کی سرحد، خیمۂ خواب، جنوں کنارا، داستانی غزلیں اور ورائے شعر زمانی ترتیب کے ساتھ شامل ہیں جو در اصل موضوعاتی ترتیب بھی ہے۔ جو اسعد بدایونی کے فنی وفکری ارتقا کی طرف قاری کی توجہ مبذول کراتی ہے۔ ان کا کچھ کلام ایسا بھی ہوگا، جو ان کے مذکورہ مجموعوں میں موجود نہ ہوگا۔ اگر اسے بھی فراہم کر کے شامل کرلیا جاتا تو کتاب کی جامعیت بڑھ جاتی۔ اسی طرح زیر نظر کلیات کے شروع میں پروفیسر اصغر عباس کا تاثراتی مضمون بعنوان '' آؤ اسعد افسوس ساز کی باتیں کریں'' شامل ہے، اگر اسعد بدایونی کی حیات وخدمات پر مشتمل ایک مضمون بھی شامل کرلیا جاتا تو شاید اس کلیات کی اہمیت اور بڑھ جاتی۔ غالباً اسعد بدایونی کی شخصیت اور شاعری کے حوالے سے علی گڑھ میگزین (2004) کے ایک خصوصی شمارے میں گوشہ شائع ہونے کی وجہ سے مرتب نے اس حصے کو شامل کرنے سے گریز کیا ہے اس کا اظہار انھوں نے ''عرض مرتب'' میں دبے لفظوں میں کیا بھی ہے۔

اسعد بدایونی غزل کے شاعر ہیں۔ ایک بیدار ذہن اور حساس شاعر ہونے کے ناطے اسعد بدایونی کی غزلوں کا دائرہ وسیع تر ہوتا گیا ہے۔ انھوں نے مختلف النوع موضوعات کو اپنی غزلوں میں سمیٹ لیا ہے۔ یہ غزلیں فرار پسند طبائع کی طرف داری نہیں کرتیں۔ یہ غزلیں ہم عصر سیاسی وسماجی نظام کی کج رویوں اور ان کے نتیجے میں معرض وجود میں آنے والے ظلم و جبر کو بے نقاب کرنے کی ایک بے باکانہ کوشش ہیں اور ان سے لطف اٹھانے کے لیے ایک خاص نوع کی ذہنی تربیت درکار ہے۔ اگر چہ اسعد بدایونی کے لب و لہجے میں بلند آہنگی موجود ہے لیکن اس کو ان کی جذباتیت سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ وہ زندگی اور مسائل زندگی پر گہری نظر رکھتے ہیں اور انھوں نے عصری صورت حال پر سنجیدگی کے ساتھ سوچا ہے۔

اسعد بدایونی اگر چہ جدید لب و لہجے کے شاعر ہیں لیکن انھوں نے کلاسیکی شعری روایات سے بساط بھر فیض اٹھایا ہے۔ انھیں احساس ہے کہ ایک چراغ جلانے کے لیے دوسرے چراغ سے روشنی لینی ہوتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

کوئی ہمدم نہیں دنیا میں اپنا
جسے دیکھو وہی ہمدم لگے ہے
جدھر دیکھو ادھر شبنم کے آنسو
چمن کیا ہے صف ماتم لگے ہے
جو دل کو بے نیاز گردش دوراں سمجھتے ہیں
وہی دیباچۂ تقدیر کا عنواں سمجھتے ہیں
کیا زمانہ تھا کہ سب عرصۂ جاں میرا تھا
خیمۂ خواب سر جوئے رواں میرا تھا

اسعد بدایونی عام روش سے ہٹ کر شاعری کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اپنے بعض ہم عصر شاعروں کی طرح انھوں نے خود کو کبھی نہیں دہرایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہر مجموعے میں نئے پن کا احساس ہوتا ہے۔ یہ نیا پن فکر کی سطح پر بھی ہے اور اسلوب کی سطح پر بھی۔ نئی ترکیبات کا استعمال ان کے یہاں بڑی خوبی سے ہوا ہے۔ جس سے ان کی فنی پختگی کا احساس ہوتا ہے۔

اسعد بدایونی کی شاعری کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ ان کے اشعار میں ایک خاص طرح کی صفائی پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے تعقید خواہ لفظی ہو یا معنوی دور دور تک نظر نہیں آتی۔ ان کی زبان میں روانی اور شگفتگی ہے اور یہ چیز ان کی شاعری کو سہل ممتنع کے قریب بھی کرتی ہے۔

تمھارے شہر کا ہر ایک انساں
بڑی حیرت سے مجھ کو دیکھتا ہے
ہمیں معلوم ہے ہر راز اس کا
ہمارے ساتھ وہ برسوں رہا ہے

زیر نظر کلیات میں چند بڑی ہی فکر انگیز نظمیں بھی شامل ہیں۔ ان نظموں میں زندگی کا گہرا مشاہدہ ملتا ہے اور پیشکش کا طریق کار کچھ ایسا ہے کہ ان کے ذاتی تجربے اجتماعی تجربے کی شکل اختیار کرلیتے ہیں، لیکن شاعر کے تجربات و مشاہدات کا بھرپور اظہار ان کی غزلوں میں ہی ہوا ہے۔ رضوان الرضا رضوان نے اس کلیات کی ترتیب میں بہت سلیقے سے کام لیا ہے۔ اس کی طباعت عمدہ ہے۔ پروف ریڈنگ بھی بڑی باریکی سے کی گئی ہے، جس کے سبب متن اغلاط سے پاک ہے۔ امید ہے کہ حلقۂ اہل ادب میں یہ کتاب نگاہ تحسین سے دیکھی جائے گی۔

آزادی کے بعد ہندوستان کا اردو ادب
(1947 تا 1962) رجحانات اور تجزیہ

مصنف: محمد ذاکر

صفحات: 314، سائز ڈیمائی، قیمت: -/275

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی-6

مبصر: ابوبکر عباد، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

محمد ذاکر صاحب کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو دہلی کی زبان، یہاں کی تہذیب وثقافت اور قدیم وضعداری کے امین ہیں۔ ایک طویل عرصے تک جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اردو زبان و ادب کے استاد کی حیثیت سے تدریسی فرائض انجام دیتے رہے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب کے علاوہ خواجہ حیدرعلی آتش کا مونوگراف اور ''انتخاب غزلیات آبرو مع مقدمہ'' ان کے علمی کاموں کی فہرست میں شامل ہیں۔ ذاکر صاحب کی شہرت اور شناخت کا ایک سبب اردو کلاسکس کے وہ انگریزی تراجم بھی ہیں جو انھوں نے خوبی، خوبصورتی اور استناد کے ساتھ کیے ہیں۔ ان میں میرامن کی داستان ''باغ و بہار''، ڈپٹی نذیر احمد کے ناول ''ابن الوقت'' اور مرزا غالب کے منتخب اردو اور فارسی اشعار کے ترجمے بطور خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

''آزادی کے بعد ہندوستان کا اردو ادب'' ان کا تحقیقی مقالہ ہے جس پر دلی یونیورسٹی نے انھیں پی۔ایچ۔ڈی۔ کی ڈگری تفویض کی تھی۔ یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے۔ جن میں حواشی، کتابیات اور اشاریہ کے علاوہ پروفیسر گوپی چند نارنگ کا تحریر کردہ ذاکر صاحب کا مختصر تعارف اور ''چشم انداز'' کے عنوان سے خود ذاکر صاحب کا پیش لفظ بھی شامل ہے۔ پہلے باب میں آزادی سے قبل کے اردو ادب کو تین ادوار میں تقسیم کر کے اس کا محاکمہ کیا گیا ہے۔ دور اول کو مصنف نے 1857 سے 1918 تک کے عرصے پر محیط کیا ہے اور اس کا عنوان اصلاح پسندی، حب الوطنی اور قومیت پرستی رکھا ہے۔ دوسرا دور 1918 سے 1936 تک کا احاطہ کرتا ہے، اسے حریت پسندی سے موسوم کیا گیا ہے۔ تیسرا دور 1936 سے 1947 تک کے عرصے پر پھیلا ہوا ہے۔ اس کا عنوان ترقی پسندی ہے۔ یہ پورا عرصہ تقریباً باسٹھ سال کی مدت پر محیط ہے جنھیں محض بیس بائیس صفحوں میں سمیٹنے کا عمل دریا کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہے۔ ظاہر ہے اس مشکل عمل میں کچھ کمیاں رہ گئی ہیں، مثلاً 1857 کے بعد جن اہم تخلیقات او تخلیق کاروں کا ذکر آنا چاہیے وہ نہیں آسکا، اسی طرح رومانیت کے رجحان پر کچھ نہیں لکھا گیا۔

یہ کتاب دوسری بار 2008 میں شائع ہوئی ہے لیکن مصنف نے قدیم اصطلاحوں اور اصناف کی پرانی تعریف کو جوں کا توں رکھا ہے۔ مثلاً انشائیہ کو وہ افسانوی مضمون کہتے ہیں:

''دوسری قسم افسانوی مضامین کی ہے (پطرس اور رشید احمد صدیقی) جو اپنے پلاٹ اور حقیقی زندگی کے گہرے مشاہدے کی وجہ سے منفرد ہیں۔ افسانوی مضامین لکھنے والوں میں فرحت اللہ بیگ کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے.....'' (ص-31)

ظاہر ہے انشائیے کی ایک صنف کی حیثیت سے تعریف متعین کی جاچکی ہے، اس موضوع پر ڈاکٹر وزیر آغا، نظیر صدیقی، جاوید وششٹ اور اطہر پرویز کے مضامین اور حسنین سید کی ''انشائیہ اور انشائیہ نگار'' کے نام سے باضابطہ کتاب موجود ہے۔ اسی طرح وہ مضامین کو ''انشائیہ'' کا نام دیتے ہیں:

''انشائیہ او رمقالہ نگاری میں بھی سرسید، حالی، شبلی اور آزاد کی روایت آگے بڑھی۔ (ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر عابد حسین، ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر مجیب، مولانا عبدالماجد دریابادی، رشید احمد صدیقی، نیاز فتح پوری، خواجہ غلام السیدین اس دور کے اہم انشائیہ نگار ہیں۔)'' (ص-34)

خاکے اور قلمی چہرے میں نازک سا اختلاف بہرحال موجود ہے تاہم ذاکر صاحب خاکوں کے لیے قلمی چہرے کی اصطلاح کو ہی روا رکھتے ہیں:

''شخصیت نگاری اور قلمی چہرے لکھنے کے رواج کو ترقی ہوئی اور اچھے نمونے سامنے آئے جو اردو میں قابل قدر اضافہ ہیں۔ رشید احمد صدیقی، خواجہ حسن نظامی کے نام اس سلسلے میں اہم ہیں۔ بعد میں شوکت تھانوی، چراغ حسن حسرت اور منٹو نے بھی کامیاب قلمی چہرے لکھے۔'' (ص-40)

ذاکر صاحب کا قدیم اصطلاحوں پر اصرار غالباً انگریزی اصطلاحوں کے ترجمے کی وجہ سے ہے لیکن آج اردو میں تمام اصطلاحوں کی تعریفیں اور ان کی تشریحات متعین اور چلن میں ہیں لہٰذا اسی پر عمل بھی کرنا چاہیے۔ پھر بھی اس عرصے کے شعری اور نثری اصناف وموضوعات پر ذاکر صاحب نے جس اختصار، جامعیت اور سلیقے سے گفتگو کی ہے وہ لائق ستائش ہے۔

منطقی طور پر 1947 تک کے شعروادب پر گفتگو کے بعد، آزادی کے بعد کی تخلیقات کو زیر بحث آنا چاہیے، جو کتاب کا تیسرا باب ہے۔ لیکن مصنف اس سے پہلے اس وقت کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات کا ذکر پس منظر کے طور پر ضروری سمجھتے ہیں چنانچہ وہ ''آزادی اور آزادی کی چھاؤں'' کے عنوان سے دوسرا باب قائم کرتے ہیں۔ یہ باب ہندوستان کی تاریخ آزادی، سیاست، تقسیم ملک کے المیے، لسانی جھگڑے، قومی زبان کے تعین کے مسئلے اور کانگریس اور کمیونسٹ پارٹیوں کی پالیسیوں اور رویوں سے متعلق ہے۔ ادبی مباحث کو اس باب میں جگہ نہیں دی گئی ہے۔ یہ باب اپنے ماقبل اور مابعد بابوں کے لیے لازمی حیثیت تو نہیں رکھتا، لیکن بہت معلوماتی ہے اور مصنف کے تاریخی شعور، سیاسی بصیرت اور اس کی آئیڈیالوجی کو کافی حد تک واضح کرتا ہے۔

تیسرے باب میں آزادی وطن کے مختلف جہات پر لکھی گئی شعری اصناف، مثلاً نظم، غزل، رباعی، قطعہ اور گیت کا ذکر کیا گیا ہے۔ مصنف نے نظم کو شعرا کی

تخلیقات سے جن موضوعات پر کثرت سے مثالیں فراہم کی ہیں، وہ ہیں آزادیٔ وطن، تقسیم ملک کے نتیجے میں برپا ہونے والے فسادات، انتقال آبادی اور گاندھی جی کی شہادت۔ غزل کی شاعری میں تقسیم ملک اور فسادات کے علاوہ رشوت ستانی، بے روزگاری، معاشی استحصال، رہنماؤں کی ناعاقبت اندیشی، اہل ہنر کی کسمپرسی اور امن کی تحریک کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ گوکہ مصنف نے کسی بھی تخلیق کا فنی یا تکنیکی جائزہ نہیں لیا ہے لیکن موضوع اور مواد کے حوالے سے انھوں نے جو گفتگو کی ہے اس سے ان کا تنقیدی شعور واضح ہوتا ہے۔ وہ اپنی رائے کا اظہار معتدل انداز میں اور دیانت داری کے ساتھ کرتے ہیں:

''ان نظموں کی نوعیت ہنگامی ہے، ذہنی انتشار کی وجہ سے فکر کی گہرائی بھی کم نظر آتی ہے اور ان میں جذبات کی شدت کی وجہ سے کہیں کہیں زبان کی خامی بھی کھٹکتی ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ خلوص کی پیداوار ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ نظمیں ایسی بھی ہیں جن میں مقصدیت اور فن کا عمدہ امتزاج نظر آتا ہے جن میں عصری آگہی ہے۔ احساس کی بے پناہ شدت ہے، فن کے آداب ہیں اور نکھار بھی۔'' (ص 98-99)

چوتھا باب نثری اصناف پر مشتمل ہے۔ جس میں 47 سے 62 کے عرصے میں لکھے گئے ناول، افسانے، ڈرامے، تحقیق وتنقید، طنزیہ ومزاحیہ مضامین، پیروڈی اور رپورتاژ پر تبصراتی نوعیت کی گفتگو کی گئی ہے۔

افسانوی حصے میں زیادہ تر ایسے افسانوں کو مرکزی حوالہ بنایا گیا ہے جو فسادات اور اس کے نتیجے میں پیش آنے والے واقعات مثلاً مغویہ عورتوں کی بحالی، انتقال آبادی، بازآبادکاری، پناہ گزینوں کی خستہ حالی اور سماجی بدعنوانیوں کے موضوعات پر لکھے گئے ہیں۔ ناول کے ضمن میں ایسے ناول زیر بحث آئے ہیں جو مشترکہ قومی تہذیب کے زوال، پرانی اقدار کے خاتمے، طبقاتی کش مکش، سماجی شعور اور صنعتی زندگی کی پیش کش پر مبنی ہیں۔ وجہ غالباً یہ ہے کہ اس عہد کے ناولوں میں افسانوں کی طرح فسادات کو غالب موضوع کی حیثیت حاصل نہ ہوسکی تھی۔

اس عہد کے ناولوں پر تبصرہ کرتے ہوئے ذاکر صاحب لکھتے ہیں:

''اس طرح اس دور کے ناول بڑی حد تک عصری زندگی کی عکاسی کرتے ہیں اور کہیں کہیں اس کی تنقید بھی۔ ان میں مواد اور تکنیک کے اعتبار سے دلکشی اور نیاپن بھی ہے۔ لیکن پھر بھی یہ ماننا پڑتا ہے کہ اس دور میں کوئی اتنا عظیم ناول سامنے نہیں آسکا جو ہماری اس بدلتی ہوئی زندگی کو فکر وفن کے امتزاج کے ساتھ قصے کے بھرپور انداز میں پیش کرسکے۔'' (ص 87-186)

تعجب ہے کہ ''آگ کا دریا'' کے ہوتے ہوئے ذاکر صاحب کو اس دور اور اس کے فن کاروں سے شکایت ہے۔ مذکورہ ناول میں فکر وفن کا امتزاج بھی ہے، قصے کا بھرپور انداز بھی ہے اور بدلتی ہوئی زندگی کی عکاسی بھی۔ اور اگر برصغیر میں اردو کے دو ''عظیم ناول'' بھی لکھے گئے ہیں تو ''آگ کا دریا'' ان میں سے بہرحال ایک ہے۔

ذاکر صاحب کی کتاب کا ذیلی عنوان (1947 تا 1962) رجحانات اور تجزیہ'' ہے۔ لیکن مصنف نے کسی بھی صنف یا فن پارے کا نہ تو فنی تجزیہ کیا ہے اور نہ ہی تکنیکی تجزیہ۔ ہاں اسے تبصراتی اور تاثراتی تحریر کے معلوماتی نمونے سے ضرور تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ کتاب میں ایک اور کمی شدت سے کھٹکتی ہے وہ یہ کہ اس میں جدیدیت کے رجحان کا سرے سے ذکر نہیں ہے اور نہ تو جدید شاعری یا جدید افسانے کا حوالہ دیا گیا ہے اور نہ ہی مثالیں فراہم کی گئی ہیں، جب کہ 55 سے جدیدیت کے رجحان کا آغاز ہوچکا تھا اور 62 تک اس پر کافی کچھ لکھا جاچکا تھا۔ اس عرصے میں جدیدیت کے رجحان کے تحت لکھی جانے والی شاعری اور افسانوں کے وافر نمونے سامنے آچکے تھے اور علمی وادبی حلقوں اور رسائل وجرائد میں اس پر خوب بحثیں چل رہی تھیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ذاکر صاحب نے اپنی کتاب میں ایک جگہ ادب میں آنے والی تبدیلیوں کا ذکر کیا ہے، لیکن نہ تو انھوں نے جدیدیت کے رجحان کا نام لیا ہے نہ ہی اس کی قبولیت کا اعتراف کیا ہے۔

شاعر، دانشور فراق گورکھپوری

مصنف: علی احمد فاطمی

صفحات: 184، قیمت: -/200 روپے

ناشر: ایم آر پبلی کیشنز، 2695، گلی کالے خاں، کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی

مبصر: ابوظہیر ربانی، شعبۂ اردو، دیال سنگھ کالج، لودی روڈ، نئی دہلی-110003

کسی ادیب یا شاعر پر قلم اٹھانا آسان ہوتا ہے لیکن ادب میں جب اس کی شناخت اور انفرادیت متعین کرنے کی بات آتی ہے تو یہ کام دشوار ہوجاتا ہے۔ اس کے لیے اس کی شخصیت اور اس کے فن سے گہری واقفیت ضروری ہوتی ہے۔ پروفیسر فاطمی صاحب نے معروضی انداز میں فراق کی شخصیت اور شاعری کا جائزہ لیا ہے۔ جو فراق کے نظریات وافکار کی تفہیم میں بہت معاون ہے۔ کتاب میں گیارہ مضامین ہیں جو فاطمی صاحب کی شعرفہمی اور فراق فہمی کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔

گفتگو کا آغاز: ''فراق— شاعر نیم شب'' کے عنوان سے ہوا ہے۔ فراق بچپن سے حسن پرست تھے لیکن ان کی شادی جس لڑکی سے ہوئی اس میں شکل وصورت کے اعتبار سے ان کے لیے کوئی کشش نہ تھی۔ نتیجتاً فراق کی زندگی بے کیفی کا شکار ہوگئی۔ اس بے کیفی کا مداوا انھوں نے شاعری میں تلاش کیا۔ اور اسی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا۔

غزل کا ساز اٹھاؤ بڑی اداس ہے رات
نوائے میر سناؤ بڑی اداس ہے رات

اگلا مضمون ''فراق کا تصور عشق'' ہے جس میں فاطمی صاحب نے ان کی عشقیہ شاعری کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے۔ موصوف کا کہنا ہے کہ فراق کا عشق محض جنس اور جسم نہیں بلکہ کچھ اور ہے جو فلسفہ بن کر ابھرتا ہے۔ فراق عشق

کے حوالے سے حیات و کائنات کو اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں۔ فراق کا تصور عشق ایک تازگی کا احساس دلاتا ہے جس نے 1947 کے بعد آنے والی نئی نسل کے غزل گو شعرا کو متاثر کیا۔ بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ فراق نے اپنی شاعری پر سیاست کی چھاپ نہیں پڑنے دی ہے لیکن یہ صحیح نہیں۔ فراق نے جس عہد میں آنکھیں کھولیں، وہ سیاسی سرگرمیوں کا دور تھا۔ چنانچہ فاطمی صاحب نے فراق کی سیاسی زندگی کا جائزہ لیتے ہوئے ترقی پسند تحریک، اشتراکیت اور کانگریس سے ان کی وابستگی کا ذکر کیا ہے۔ بعد میں فراق کی فکر میں مزید وسعت آئی۔ اس کا اظہار انھوں نے اپنے ایک مضمون میں اس طرح کیا ہے:

''ہمارا ملک ہندوؤں کی ملکیت نہیں ہے اور نہ مسلمانوں کی۔ یہ ملک بنی نوع آدم کا مادر وطن ہے...... ہم ہندوستانی ضرور ہیں لیکن کرۂ ارض یا کائنات کے شہری بھی ہیں۔''

فراق کی روشن خیالی، کی بنیاد پر ہی پروفیسر علی احمد فاطمی نے ایک مضمون میں فراق کی دانشوری پر زور دیا ہے اور ان کی اس حیثیت سے انکار۔ فاطمی صاحب فراق کے خلاف سازش قرار دیتے ہیں۔

فراق کی غزل کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے لیکن ان کی بعض نظموں کا شمار اردو کی عمدہ نظموں میں ہوتا ہے۔ فاطمی صاحب نے فراق کی نظم ''آدھی رات'' کا تجزیہ کیا ہے جہاں فطرت اور فکر ایک دوسرے میں مدغم ہوتے نظر آتے ہیں۔

فراق میں بعض انسانی کمزوریاں بھی تھیں جن پر علی احمد فاطمی نے روشنی ڈالی ہے۔ ان کی ذات میں تضادات بھی تھے جو اختلافات کی بنیاد بنتے رہے ہیں۔ شہرت کی ہوس بھی تھی۔ مگر یہ تمام کمزوریاں بقول پروفیسر محمد حسن فراق کی شخصیت میں ایک عجیب قسم کے بھولپن کا نتیجہ تھیں۔

پروفیسر علی احمد فاطمی نے اس کتاب میں فراق کی شخصی اور ادبی زندگی کا ایک مرقع پیش کر دیا ہے جس کے مطالعے سے فراق کے فکر و فن کے کئی گوشے وا ہوتے ہیں۔

لاوا

مصنف: رحمان شاہی
صفحات: 256، قیمت: -/200 روپے
ناشر: بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ
مبصر: عاقل زیاد، بی-176، پاکٹ-1، میور وہار، دہلی-91

رحمان شاہی کا افسانوی مجموعہ ''لاوا'' بہار اردو اکادمی کے جزوی مالی تعاون سے شائع ہوا ہے۔ دیباچے میں انھوں نے اپنے افکار و احساسات کو تفصیل سے پیش کیا ہے۔ رحمان شاہی کے افسانے پڑھتے ہوئے کشمکش اور افراتفری کی کیفیت سے دوچار عام آدمی کی زندگی کی جیتی جاگتی سچائیاں سامنے آتی ہیں۔ سماجی سروکار پر مبنی ان کی کہانیوں میں عام انسانوں کے دکھ درد کو محسوس کیا جا سکتا ہے جو خوفناک سماجی انتشار سے دوچار ہیں۔ آج کے انسان کے سامنے ایسا گھنا اندھیرا ہے جس میں حق و ناحق کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ رحمان شاہی نے اپنی کہانیوں میں اسی عام انسان کے روز و شب کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی بیشتر کہانیوں میں فسادات کا ذکر آیا ہے ایک کہانی ''سانپ کا پھن پکڑنے والے'' میں امن پسند لوگوں کے درمیان فرقہ وارانہ زہر پھیلانے والے اس آسیب کو جکڑنے کی کوشش کی گئی ہے جو اپنے مفاد کے لیے عام انسانی جبلتوں کے سہارے پر امن ماحول میں عصبیت کو بڑھاوا دیتا ہے اور رفاصے گہرے دوست بھی وقتی طور پر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں۔ ایک اور کہانی ''لاوا'' میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ فسادات میں جب کوئی اپنا کھو جائے تو اس کا درد انسان کو کس طرح کچوکے لگاتا ہے، مدتوں کی خاموشی ایک آدھ گردن کٹی مرغی کی تڑپ اور پھڑپھڑاہٹ کو دیکھ کر کس طرح لاوے کی مانند پھوٹ پڑتی ہے اور مرغی ذبح کرنے والا اگرچہ خود حالات کی ستم ظریفی کا مارا ہے، بے رحم قاتل کی شکل میں نظر آنے لگتا ہے۔ زندگی کی کربناکی ''راستے بند ہیں'' میں دیکھنے کو ملتی ہے جب ناتھن کہتا ہے ''ہم بُجدل ناہیں ساب........ جینا چاہت ہیں اس باسطے بھاگتے ہیں......'' اس کہانی میں بھی عام انسان کی زندگی میں پیش آنے والی حقیقتوں سے سامنا ہوتا ہے اور انکرو چمنٹ ہٹانے کے نام پر بندوق دھاریوں کے ظلم اور استحصال کی سچی تصویر سے سابقہ پڑتا ہے۔ کہانی ''انصار بھائی کی چینا'' کا موضوع اچھوتا نہیں ہے البتہ پیش کش میں تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ کہانی میں پروفیسر دلشاد، اے ڈی ایم صاحب، سردار خاں اور دیگر جتنے بھی کردار آئے ہیں خود اپنے آپ میں ہی بکھرے ہوئے ہیں وہ بھلا ایک معاشرے کو تشکیل دیں تو کیوں کر۔ کہانی میں ''چنیا'' کا مرکزی کردار منٹو کی ''سوگندھی'' کی طرح ہے جسے یکا یک ایک نئی تہذیب کے انکشاف سے نہ صرف گھبراہٹ ہوتی ہے بلکہ نفرت بھی ہوتی ہے ''ہتک'' میں منٹو نے ایک خاص طبقے کی زندگی اور ماحول کو جس حقیقت پسندی سے پیش کیا ہے اپنے آپ میں بے مثال ہے رحمان شاہی کی اس کہانی میں پسماندہ طبقے اور اشرافیہ کے درمیان مدتوں سے حائل گہری خلیج دیکھنے کو ملتی ہے۔ ایک تہذیب یافتہ ہوئے بغیر انسانی اقدار کا حامل تو دوسرا مہذب کہلانے کے بعد بھی نام نہاد سماجی اصولوں کے خول میں سمٹا اپنی کمزوریوں کو چھپاتا نظر آتا ہے۔ ''سلوگن''، ''وہ روشنی'' اور ''دھوپ کا سائبان'' وغیرہ سبھی کہانیوں میں خود اپنے ہی وجود کی تلاش میں سرگرداں انسانوں کی بےچینی کا شدید احساس ہوتا ہے۔

کتاب میں شامل سبھی افسانے قابل مطالعہ ہیں اور انھیں پڑھ کر یک گونہ آسودگی کا احساس ہوتا ہے۔ رحمان شاہی نے اپنی کہانیوں کی تعمیر میں جس ماحول اور معاشرے سے اینٹ اور گارے کو لیا ہے وہ مرکزی بہار کی علاقائی خوشبو سے معطر ہے۔ امید ہے کہ ارباب ذوق میں یہ کتاب پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

□□□

زہرہ پری رخ

اخروٹ کی میٹھی روٹی

بہت پرانی بات ہے۔ ایک ٹیلے کے پاس ایک چھوٹا سا گھر تھا۔ اس گھر میں ایک کسان کنبہ رہتا تھا کسان اور اس کی بیوی کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ ان کے چھوٹے بیٹے کا نام یونس تھا۔ ان کے پاس ایک بھیڑ بھی تھی۔ اس بھیڑ کو یونس کا بھائی اور بہن باری باری چرانے کے لیے لے جاتے تھے۔ یونس بھی اس بھیڑ کو چرانے کے لیے لے جانا چاہتا تھا لیکن چونکہ وہ چھوٹا تھا اس لیے اس کی اجازت نہیں تھی۔ یونس پوچھتا تھا: ''میں بھیڑ کو چرانے کے لیے کب لے جاسکوں گا؟''

اس کی بہن کہتی تھی: ''اس روز جب تو میری طرح پانی کی بالٹی اٹھا سکے گا۔''

اس کا بھائی کہتا تھا: ''اس روز جب تیرا قد میری طرح باڑ تک پہنچ جائے گا۔''

اس سے پہلے کہ یونس پانی کی بالٹی اٹھا سکتا، یا اس کا قد باڑ تک اونچا ہوتا، ایک دن اس کے والد نے یونس کی پشت پر ہاتھ مار کر کہا: ''آج یونس بھیڑ چرانے لے جائے گا۔''

یونس خوشی خوشی طبیلے کی طرف بھاگا، اس نے بھیڑ کو باہر نکال کر اپنے آگے کیا اور خود اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ چراگاہ میں کتنے ہی سبز ٹیلے تھے۔ یونس کا بڑا بھائی اور بہن بھیڑ کو صرف تیسرے ٹیلے تک لے جاتے تھے اور واپس لے آتے تھے۔ لیکن یونس تیسرے ٹیلے سے بھی آگے بڑھا اور چوتھے ٹیلے تک پہنچ گیا۔ وہ چوتھے ٹیلے پر تھکن دور کرنے کے لیے بیٹھ گیا۔ بھیڑ یونس کے آس پاس گھوم کر چر رہی تھی۔ یونس نے اپنے آپ سے کہا: ''اب سب دیکھیں گے کہ ہماری بھیڑ ہمیشہ سے زیادہ سیر ہو کر واپس ہوئی ہے۔''

وہ ابھی انھی خیالوں میں تھا کہ دھیرے دھیرے اسے نیند آ گئی۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے بھیڑ کو اپنے آس پاس نہیں پایا۔ وہ اپنی جگہ سے اچھلا اور اس نے چیخ ماری، ''ہائے میری بھیڑ، میری بھیڑ۔۔۔''

بع بع کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ اسے پانچویں ٹیلے پر بھیڑ دکھائی دی۔ ایک لڑکا بھیڑ کے پاس دوزانو بیٹھا ہوا تھا اور اس نے بھیڑ کے گلے میں ہاتھوں کا حلقہ ڈال رکھا تھا۔ یونس چوتھے ٹیلے سے نیچے دوڑا اور اس نے اونچی آواز میں کہا: ''اے لڑکے، وہ میری بھیڑ ہے۔''

پھر وہ پانچویں ٹیلے کے اوپر گیا۔ جب یونس وہاں پہنچا تو اس لڑکے نے کہا، ''کیا تو اپنی بھیڑ اس میٹھی روٹی سے بدلے گا؟''

یونس نے کہا، ''نہیں۔''

لڑکا بولا، ''دیکھ، دیکھ کیسی میٹھی روٹی ہے، اس میں اخروٹ ہے، لے۔''

یونس نے میٹھی روٹی لی اور اس میں سے ایک لقمہ کھایا۔ وہ بہت لذیذ تھی۔ اس نے ایک لقمہ مزید کھایا اور پھر مزید ایک لقمہ۔ جونہی اس نے آخری لقمہ کھایا لڑکے نے کہا، ''اچھا، تو نے میٹھی روٹی کھالی، اب یہ بھیڑ میری ہے۔''

یونس نے کہا، ''نہیں، نہیں۔ ہمارے پاس یہی ایک بھیڑ ہے۔''

لڑکے نے کہا، ''میرے پاس بھی ایک ہی میٹھی روٹی تھی۔''

اور وہ بھیڑ لے کر اپنی راہ چل پڑا۔ یونس نہیں جانتا تھا کہ کیا کرے۔ اس نے دکھی ہوکر خود سے کہا، ''میں نے میٹھی روٹی کیوں کھائی؟ کیوں؟''

یونس بہت زیادہ رنجیدہ ہوکر گھر واپس ہوا۔ اس کی بہن اس کے انتظار میں کھڑی تھی۔ جوں ہی اس نے اسے دیکھا وہ چیخی، ''یونس بھیڑ کہاں ہے؟ تو نے بھیڑ گم کردی؟''

یونس رونے لگا اور بولا، ''نہیں۔''

باپ نے پوچھا۔ ''یونس جان، کیا بھیڑ کو بھیڑیا اٹھا کر لے گیا؟''

ماں نے پوچھا، ''یونس جان، کیا بھیڑ کو لومڑی اٹھا کر لے گئی؟''

یونس نے کہا، ''کاش اسے لومڑی اٹھالے جاتی۔''

اس کے بھائی نے کہا، ''یونس جان کیا بھیڑ کو ہوا اڑا کر لے گئی؟''

یونس نے کہا، ''نہیں نہیں، کاش ہوا اڑا کر لے جاتی۔ میں نے بھیڑ ایک میٹھی روٹی کے بدلے ایک لڑکے کو بیچ دی۔''

ماں نے کہا، ''کیا؟''

باپ نے کہا، ''آخر وہ کیسی میٹھی روٹی تھی جس کے لیے تیرے دل میں بھیڑ بیچنے کا خیال آ گیا؟''

یونس کچھ کہہ نہیں رہا تھا صرف رو رہا تھا۔

ماں نے کہا، ''اچھا بتا، اس روٹی کا مزہ کیسا تھا تا کہ میں ویسی ہی ایک روٹی بناؤں۔ وہ ہم اس لڑکے کو دیں گے اور اپنی بھیڑ واپس لیں گے۔''

یونس نے کہا، ''وہ میٹھی تھی۔ اس میں اخروٹ بھی تھے۔''

ماں نے ایک میٹھی روٹی تیار کی اور یونس کو دی جو میٹھی بھی تھی اور اس میں اخروٹ بھی تھے۔ یونس نے اسے کھایا اور بولا، ''نہیں نہیں، یہ اس سے کم میٹھی ہے۔'' اس روٹی میں اخروٹ بھی زیادہ تھے۔

ماں نے ایک دوسری روٹی بنائی۔ یونس نے اسے بھی کھایا اور بولا،'' وہ ایسی ہی میٹھی اور اخروٹ والی تھی لیکن اس سے زیادہ بڑی تھی۔''

آخر ماں نے بالکل ویسی ہی ایک میٹھی روٹی بنائی جیسی اس لڑکے نے یونس کو دی تھی۔ ماں نے ویسی کچھ میٹھی روٹیاں دستی میں باندھیں۔ دستی یونس کو دی اور اسے اپنی بھیڑ واپس لانے کے لیے بھیجا۔

یونس پہلے ٹیلے سے گزرا۔ دوسرے ٹیلے سے گزرا۔ وہ تیسرے ٹیلے سے بھی گزرا اور چوتھے ٹیلے پر پہنچ گیا۔ اس نے اس لڑکے کو دیکھا کہ وہ بھیڑ کے ساتھ کھڑا ہے اور ایک چھوٹی گٹھری بھی اس کے ہاتھ میں ہے۔ یونس اس کے قریب گیا۔ اس نے وہ دستی جس میں اس کی والدہ نے میٹھی روٹیاں باندھی تھیں، اس لڑکے کو دی اور بولا،'' میری ماں نے یہ میٹھی روٹیاں بنائی ہیں۔ بہت زیادہ ہیں۔ جتنا تیرا جی چاہے، تو کھا۔''

اس لڑکے نے شرمندگی کے ساتھ وہ دستی لی اور اپنی چھوٹی گٹھری یونس کو دی اور بولا،'' یہ میٹھی روٹیاں بھی میری ماں نے بنائی ہیں بہت زیادہ ہیں جتنا جی چاہے، تو کھا۔''

یونس نے کہا،'' میں تجھے وہ میٹھی روٹی واپس کرنے کے لیے آیا ہوں جو میں نے کھالی تھی، تا کہ اپنی بھیڑ واپس لے سکوں۔''

لڑکے نے کہا،'' میں بھی تجھے تیری بھیڑ واپس کرنے کے لیے آیا ہوں۔ میری ماں کہہ رہی ہے کہ ایسی ہزاروں روٹیوں سے بھی ایک بھیڑ خریدی نہیں جا سکتی۔''

لڑکا جانے کے لیے بڑھا۔ یونس نے کہا،'' میں اپنی بھیڑ کو چرانے کے لیے لے جانا چاہتا ہوں۔ کیا تو نہیں آئے گا؟''

لڑکا کچھ کہے بغیر یونس کے پیچھے چل پڑا۔ وہ تیسرے ٹیلے سے گزرے، دوسرے ٹیلے سے گزرے اور پہلے ٹیلے تک پہنچ گئے۔ یونس نے کہا،'' دیکھ وہاں ہمارا گھر ہے۔ جب تیرا دل چاہے تو آ جانا۔''

لڑکے نے کہا،'' ٹھیک ہے۔'' اور خدا حافظ کہہ کر چلا گیا۔

اس دن کے بعد ہر بار جب یونس بھیڑ کو چرانے کے لیے لے جاتا ہے تو چوتھے ٹیلے پر ایک اچھا دوست میٹھی روٹیوں سے بندھی دستی کے ساتھ اس کا منتظر رہتا ہے۔ (فارسی سے ترجمہ) مترجم: محمد یحییٰ جمیل

□□□

Smt. Kesharbai Lahoti Mahavidyalay, Post: Shivaji Nagar, At: Amravati-444603

ایم یوسف انصاری

ملا نصرالدین آفندی کے لطیفے

دودھ کا پیالہ اور آری:

ایک کنجوس رئیس نے ملا نصرالدین کی دعوت کی۔ رئیس نے اپنا پیالہ بکری کے دودھ سے بھر لیا اور بچا ہوا تھوڑا سا دودھ ملا کے پیالے میں انڈیل دیا۔ ''نوش فرمایئے حبیب من۔ فی الحال اس سے بہتر کوئی مشروب نہیں۔'' ملا نصرالدین نے ادب سے کہا ''مہربان میزبان! کیا آپ ایک آری مہیا کر سکتے ہیں؟''

''آری؟'' میزبان نے تعجب سے پوچھا ''مگر کس لیے؟'' ملا نے دودھ کا نصف پیالہ اس کی طرف دیتے ہوئے کہا۔ ''پیالے کا اوپری نصف حصہ بے کار ہے۔ میں اسے کاٹ کر پھینک دوں گا۔'' اور اٹھ کر چلے گئے۔

چمچے کی آواز:

ایک مرتبہ ایک سازندے نے ملا نصرالدین کو دعوت دی۔ جب وہ اس کے یہاں پہنچے تو سازندے نے ایک ایک ساز کو چھیڑنا شروع کیا۔ کبھی بانسری تو کبھی وینا تو کبھی ستار بجاتا تھا۔ کافی دیر تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ ادھر بھوک کے مارے ملا کی آنتیں قل ھو اللہ پڑھ رہی تھیں۔ سازندے نے پوچھا۔ ''اب بتایئے ان میں کون سا ساز سب سے بہتر ہے؟'' ملا نصرالدین نے جل کر کہا ''سوپ بھرے پیالے میں چمچے کی آواز سے بہتر کوئی آواز نہیں۔''

جنت میں جانے کا آسان نسخہ:

ایک دن بادشاہ نے ملا نصرالدین سے پوچھا ''جنت میں جانے کا آسان نسخہ کون سا ہے؟'' ملا نے کچھ سر کھجایا۔ کچھ داڑھی ہلائی اور بزرگانہ انداز میں نصیحت کی۔ ''آسان نسخہ یہ ہے کہ آپ دن اور رات سوتے رہیں۔ انشاء اللہ سیدھے جنت میں جائیں گے۔''

''ملا صاحب! کیا آپ سنجیدہ ہیں۔ مذاق چھوڑیئے اور مجھے کچھ نصیحت فرمایئے۔''

''میں یقین سے کہتا ہوں کہ سب سے آسان نسخہ یہی ہے۔ اگر آپ دن رات سوتے رہیں گے تو آپ کی حکومت میں عوام پر جو ظلم ہو رہے ہیں ان کا سلسلہ کم ہو جائے گا۔ لوگ آپ کو دعا دیں گے۔ جب ظلم کرنے کا عذاب آپ کے سر نہ ہوگا تو پھر آپ جنت کے حقدار ہوں گے۔''

مبارک گھڑی:

ایک دن بادشاہ نے ملا سے پوچھا ''تم نے اپنے گدھے پر دنیا جہان کی سیر کی ہے۔ بھلے برے لوگوں سے واسطہ پڑا ہے۔ میرے ایک سوال کا جواب دو۔ میری رعایا کے لیے سب سے مبارک گھڑی کون سی ہو سکتی ہے؟''

ظل الٰہی! خاطر جمع رکھیے۔ ابھی وہ مبارک گھڑی آنے میں دیر ہے۔ جس دن آپ جنت کو سدھاریں گے۔ آپ کی رعایا کے لیے وہی مبارک گھڑی ہوگی۔''

خونخوار کتا:

شہر کے منصف نے رشوت میں ملا نصرالدین سے ایک کتا طلب کیا اور کہا ''کتا خونخوار اور بے رحم ہونا چاہیے۔ تاکہ لوگ اس سے ڈر کر دور بھاگیں۔ بات بات پر کاٹ کھانے کو دوڑے۔ لوگوں کا جینا حرام کر دے۔'' چند دنوں کے بعد ملا نے ایک خوبصورت، خوش مزاج کتا منصف کو لا کر دیا۔ تو اس نے غصے سے کہا ''کیا تم بہرے ہو۔ میں نے خونخوار، غضبناک مزاج والا کتا لانے کو کہا تھا۔ یہ تو اتنا بے ضرر لگتا ہے کہ بچے بھی اس سے خوف نہ کھائیں گے۔'' ملا نے جواب دیا جو میں نے دونوں کانوں سے سنا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہی کتا آپ کے لیے مناسب ہے۔ صرف چند ہفتوں کی بات ہے۔ آپ کی رفاقت میں رہ کر یہ خونخوار، کٹ کھنا اور ظالم کتا بن جائے گا۔''

جنازہ:

ایک مرتبہ ملا نصرالدین جنازے کے ساتھ جا رہے تھے۔ ایک شخص نے پوچھا آپ کے خیال میں جنازے کے آگے چلنا بہتر ہے یا پیچھے؟''

ملا نے اس کے کان میں کہا ''آگے پیچھے چلنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سچ تو یہ ہے کہ جنازے کے باہر کی جگہ بہتر ہے بہ نسبت اس کے اندر کی جگہ کے۔''

□□□

پتہ:
368, New Ward,
Maligaon-424203

فراغ روہوی

سردی کا موسم

سردی کا موسم آیا ہے ٹھنڈک سے تن کانپ رہا ہے
لوگ ہیں سارے سوئٹر پہنے اور کانوں پہ مفلر باندھے
ہر گھر میں سردی لے آئی چادر، کمبل اور رضائی
بند سبھی گھر کے پنکھے ہیں روم ہیٹر کے دن پلٹے ہیں
دھوپ سہائی لگتی ہے اب اس سے راحت ملتی ہے اب
ڈھونڈ رہی ہے دنیا ساری کلّہ، پایا اور نہاری
کافی پینے کے دن آئے اب یوں جینے کے دن آئے
اسکولوں میں چھٹی ہوگی کھیلیں گے جب مرضی ہوگی

گرم فراغ اب موزے پہنو
دستانے بھی پہن کے نکلو

●

پتہ:
67, Maulana Shaukat Ali Street,
(Colootola Street), Kolkata-700073

اقبال کی کہانی (پانچواں ایڈیشن)

مصنف: جگن ناتھ آزاد

اقبال کو عالمی ادب کے منظرنامے میں اہم مقام حاصل ہے۔ شاعرانہ کمالات کے علاوہ ان میں شگفتہ مزاجی بھی غضب کی تھی۔ ان کی علمی اور ادبی بحثوں میں بڑے باریک نکتے اور بذلہ سنجی پائی جاتی ہے۔ اقبال کو اپنے ملک وقوم کے بچوں کے مستقبل سے والہانہ لگاؤ تھا جس کے سبب انھوں نے بچوں کے لیے بہت سی خوب صورت نظمیں لکھیں۔ ماہر اقبالیات جگن ناتھ آزاد نے اقبال کی ہمہ گیر شخصیت کا جامع تعارف اس کتاب میں پیش کیا ہے۔

صفحات: 83، قیمت-/13 روپے

کتب فروشوں اور ادب کے قارئین کے لیے خوشخبری

قومی اردو کونسل کی مندرجۂ ذیل مطبوعات 75 فیصد کمیشن پر طلب کی جاسکتی ہیں

اپنی ضرورت کی کتابوں کا آرڈر آج ہی بھجوائیں

نمبر شمار	کتاب کا نام	قیمت اصل	قیمت مابعد رعایت 75%
01	آزادی کے بعد سائنس اور ٹیکنالوجی	123.00	31.00
02	افغانستان میں جدید دری فارسی شاعری	80.00	20.00
03	عہدِ ناظم کتب خانہ داری ایک تعارف	55.00	14.00
04	علی وردی اور اس کا عہد	86.00	22.00
05	عشری درجہ بندی	167.00	42.00
06	آڈیٹنگ کے بنیادی اصول	331.00	83.00
07	چولا راجگان	209.00	52.00
08	فلسفیانہ تجزیہ: ایک تعارف	120.00	30.00
09	فیودر دستوئیفسکی	52.00	13.00
10	غرائب الجمل	76.00	19.00
11	گلشنِ بے خار	128.00	32.00
12	ہمارا قدیم سماج	54.00	14.00
13	ہندوستان کی خارجہ پالیسی کی بنیادیں	33.00	08.00
14	ہندوستان کی قانونی تاریخ (جلد اول، دوم)	262.00	66.00
15	ہندوستان میں چھاپہ خانہ	52.00	13.00
16	ہندوستانی سیاسی نظام کا تدریجی ارتقا	95.00	24.00
17	ہندوستانی معیشت	134.00	34.00
18	ہندوستانی مصوری عہدِ مغلیہ میں	158.00	40.00
19	ہندوستانی مصوری: ایک خاکہ	130.00	33.00
20	حیدرآباد کے اردو روزناموں کی ادبی خدمات	92.00	23.00
21	ابتدائی علمِ شہریت	47.00	12.00
22	انسانی ارتقا	70.00	18.00
23	انتظامی قانون کے اصول	120.00	30.00
24	جامع انگریزی اردو ڈکشنری (جلد۔1-6)	3400.00	850.00
25	جامع اردو انسائیکلوپیڈیا (جلد۔4-1 اور 8-6)	1790.00	448.00
26	جنت سنگار	180.00	45.00
27	کلیاتِ پریم چند (جلد 1 تا 24)	4071	1018.00

28	للو لال جی ایک ادبی سوانح	72.00	18.00
29	لغت ابجد شاری (جلد۔1، حصہ دوم)	387.00	97.00
	لغت ابجد شاری (جلد۔2، حصہ اول ودوم)		
30	مجموعہ نغز	268.00	67.00
31	مسدود راہیں	126.00	32.00
32	مثنوی بہرام وگل اندام	66.00	17.00
33	مولیئر	57.00	14.00
34	مسلم ہندوستان کا زراعتی نظام	92.00	23.00
35	اڑیسہ میں اردو	157.00	39.00
36	پشکن	60.00	15.00
37	قدیم ہندی فلسفہ	82.00	21.00
38	قدیم ہندوستان میں شُودر	82.00	21.00
39	قومی زبان	76.00	19.00
40	قواعد کیٹیلاگ سازی	268.00	67.00
41	صنعتی تنظیم اور انتظام	149.00	37.00
42	سیرِ کہسار	167.00	42.00
43	طبیعیات کے بنیادی تصورات	82.00	21.00
44	تمل ناڈو میں اردو	135.00	34.00
45	تنقید عقل محض	158.00	40.00
46	تاریخ طبعی (جلد۔1)	43.00	11.00
47	تاریخ فلسفہ سیاسیات	97.00	24.00
48	تشریحی تصاویر	66.00	17.00
49	توضیحی لسانیات	136.00	34.00
50	تذکرۂ مخطوطات (جلد۔5-1)	431.00	108.00
51	تالستائے	46.00	11.00
52	اصولِ معاشیات	47.00	12.00
53	اتر پردیش کے لوک گیت	120.00	30.00
54	وجے نگر کے عہد میں نظامِ حکومت	118.00	30.00
55	وادیٔ سندھ اور اس کے بعد کی تہذیبیں	45.00	11.00
56	وضاحتی کتابیات (جلد 1، 3-22)	2650.00	663.00
57	زراعتی انکشافات	192.00	48.00
58	آسان اردو شارٹ ہینڈ	92.00	23.00

59	عکس اور برعکس	128.00	32.00
60	امریکی ادب کا مختصر جائزہ	52.00	13.00
61	دھوپ چولھا	38.00	10.00
62	اجارہ	131.00	33.00
63	فسانۂ آزاد جلد 1 تا 4	1163.00	291.00
64	ہندوستانی سرزمین اور عوام	30.00	08.00
65	ہندوستان کا صنعتی ارتقا	130.00	33.00
66	ہندوستان میں بیوپاری کارپوریشن	188.00	47.00
67	ابتدائی سماجیات	43.00	11.00
68	ارتقا کائنات انسان و دیگر مضامین	94.00	24.00
69	جدید ابتدائی منطق	57.00	14.00
70	جان کمپنی سے جمہوریہ تک	114.00	29.00
71	کائنات جلیل	80.00	20.00
72	کتب خانہ داری ایک تعارف	108.00	27.00
73	معاشیات کے بنیادی اصول	82.00	21.00
74	مسلمانوں کے سیاسی افکار اور ان کا انتظام حکومت	82.00	21.00
75	پیائش و نقشہ کشی	85.00	21.00
76	قدیم تامل ناڈو میں عربی و فارسی	98.00	25.00
77	سفرنامہ فرہنگ مسیر طالبی	73.00	18.00
78	شہیدان آزادی (جلد اول و دوم)	213.00	53.00
79	شخصیت کے نظریات	92.00	23.00
80	شماریات اور کاروبار میں ان کا استعمال	150.00	38.00
81	سخنوران گجرات	77.00	19.00
82	تاریخ ہندی فلسفہ (جلد اول)	89.00	22.00
83	تاریخ آصفی	58.00	15.00
84	اجرتیں	95.00	24.00
85	جدید ہندوستان کے سماجی و سیاسی افکار	178.00	45.00
86	جنوبی ہند کی تاریخ	114.00	29.00

یہ رعایت 31 مارچ 2010 تک دی جائے گی۔

نوٹ:۔ محصول ڈاک اور محصول مال برداری (Transportation) خریدار کے ذمے ہوگا، کتابوں کی قیمت پیشگی روانہ کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-8، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

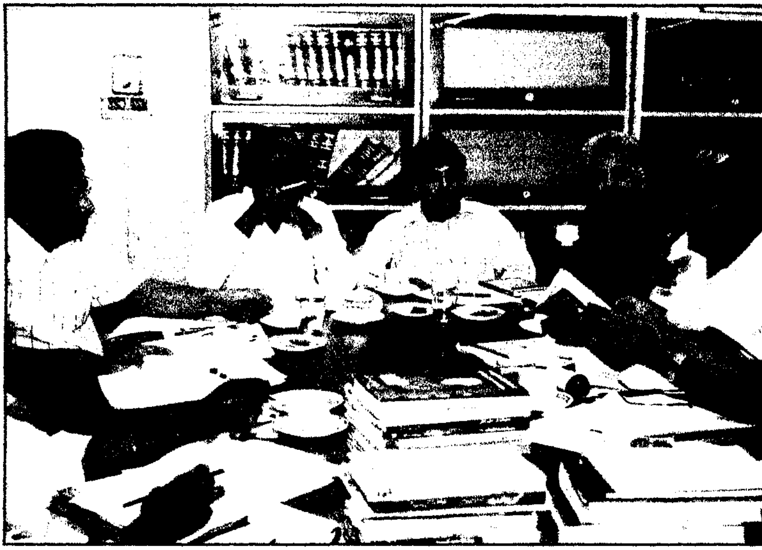

یکم اکتوبر 2009 کو قومی اردو کونسل بلک پرچیز کمیٹی کی میٹنگ ہوئی جس میں اردو کی ایک سو ایک کتابوں کی خریداری اور 47 جرائد کی سالانہ خریداری کی منظوری دی گئی، مالیت 14,98,366 روپے۔
تصویر میں (دائیں سے) جناب زبیر رضوی، ڈاکٹر ارتضیٰ کریم، ڈاکٹر اطہر فاروقی، جناب چندر بھان خیال اور ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ تبادلۂ خیال کرتے ہوئے۔

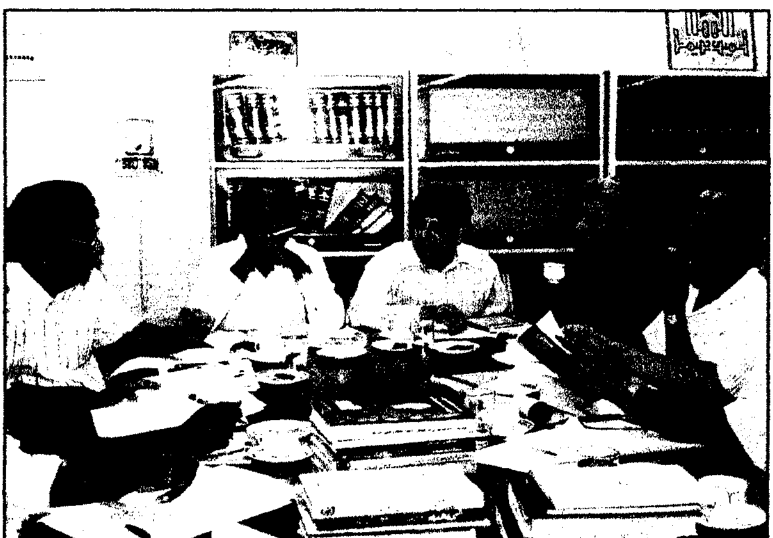

RNI No. 70323/99
[illegible] 2009-11
Date of Publication : 24/10/2009
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

URDU DUNIYA **Monthly, November 2009, Vol. 11, Issue: 11**
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of H.R.D., Government of India

قومی اردو کونسل کا سہ ماہی تحقیقی جریدہ

''فکر و تحقیق''

جو ہر سہ ماہی پر دعوت فکر دینے والے تحقیقی مواد کے ساتھ منظر عام پر آتا ہے

جس میں شائع ہونے والے مضامین کا خاصہ ہے معلوم حقائق کی چھان بین اور نامعلوم حقائق کی دریافت

صرف ایک جریدہ نہیں، ماضی کے اندوختوں اور حال کے

اکتسابات سے مستقبل کو مالا مال بنانے کی ایک تحریک

خود بھی اس رسالے کے خریدار بنیں اور دوسروں کو بھی اس کی خریداری کا مشورہ دیں۔

ہندوستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت : 100 روپے، فی شمارہ 25 روپے

زر سالانہ بذریعہ ڈرافٹ، منی آرڈر یا چیک NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

Printed and Published by Dr. M. Hamidullah Bhat, Director, NCPUL on behalf of NCPUL West Block-1, Wing-6, R.K. Puram, New Delhi-110066, and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 on 70 GSM Paper produced by TNPL   Editor: Dr. M. Hamidullah Bhat, Tel: 26103381, 26103938